

عشق زیر عشق زبر

سرور شاذ



عشق زیر عشق زبر

سرور شاذ

ناشر
علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۴۷۴۱۴

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بار اول ————— ۲۰۰۶ء

مطبع ————— یو این ڈی پرنٹرز، لاہور

کمپوزنگ ————— ڈیزائن ویلی، لاہور

قیمت ————— روپے

پاکستانی یو اینٹ
ڈاٹ کام

اسٹاکسٹ

علی بابا سٹال

نسبت روزی، چوک میوہ ہسپتال، لاہور

انتساب

میرے چارٹو محبت اور سچائی کی روشنی

بکھیرنے والی زوہیہ کے نام

سرور شاد

پاکستانی وقار
دارت علامہ
یونس خان

دیباچہ

سرور شاذ کو میں تب سے جانتی ہوں جب ایک ماہنامہ میں ان کی تحریریں باقاعدگی سے شائع ہوتی تھیں۔ ان کے لکھنے کا انداز منفرد تھا۔ ان کی تحریروں میں دکھ، کرب اور سچائی کی تشبیہات نمایاں تھیں۔ ان کی ایک دو تحریریں نظر سے گزریں تو ان کی تحریروں کا انتظار رہنے لگا۔ یہ میرے پسندیدہ رائٹر بن گئے۔ ان کی تحریر کی صورت میں جب خواہش پوری ہو جاتی تو من میں خوشیوں کی کلیاں کھل اٹھتیں۔ جب درمیان میں وقفہ آ جاتا تو یوں لگتا جیسے کچھ کھو گیا ہو۔ ان کی کمی شدت سے محسوس ہونے لگتی۔ اب موجودہ ناول کی صورت ایک دیرینہ خواہش پوری ہوئی ہے۔ موجودہ ناول سرور شاذ کی ایک ایسی کامیابی ہے جو پڑھنے والوں کو متحیر کر دے گی۔ سرور شاذ نے اپنے ناول کا دیباچہ لکھوانے کے لیے جب مجھ سے رابطہ کیا تو میں حیران رہ گئی۔ خوشی سے میری آنکھیں نم ہو گئیں۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سرور شاذ اپنے پہلے ناول کا دیباچہ مجھ سے لکھوائے گا۔ مجھے دیباچہ لکھنے کی کوئی سمجھ بوجھ نہ تھی۔ سرور شاذ کی خواہش کا احترام کرنا بھی لازم تھا، قلم ہاتھ میں پکڑ کر گھنٹوں سوچتی رہی۔ پھر لکھنے لگی۔ تحریریں تو بے شمار لکھی گئی اور لکھی جا رہی ہیں لیکن حقیقت نگاری سے دور نظر آتی ہیں ان میں بناوٹی اور افسانوی رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ ان میں جدائی کی کڑی دوپہریں اور مشکلات کے پہاڑ ہوتے ہیں مگر مشکلات کے پہاڑوں کو پاٹ لیا جاتا ہے، ملن کی آسودگی زندگی میں مسرتوں کے رنگ گھولتی نظر آتی ہے مگر حقیقت اور افسانے میں فرق ہوتا ہے۔ حقیقت حقیقت ہوتی ہے۔ موجودہ ناول بھی ایک حقیقت پر مبنی ہے۔ ایسی حقیقت جو پڑھنے والوں کو ضرور حیران کرے گی۔ ایسی سچائیاں لاکھوں میں کسی ایک کی زندگی میں نظر آتی ہیں ایسی محبتیں خاص لوگوں کا وصف ٹھہرتی ہیں۔ محبت کی سچائی میں بہت طاقت ہوتی ہے۔ اس کے زیر اثر ناممکن کام ممکن ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار ناول بھی محبت میں پیش آنے والی

مشکلات کے زیر اثر رہا۔ لم مری میں محبت کے انمول جذبے کی لپیٹ میں آ گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس جذبے نے سانول کے دل میں مضبوطی سے اپنے قدم جمائے۔ کہا جاتا ہے کہ بے وفائی مردوں کا شیوہ ہے لیکن یہاں ایک مرد وفا کے تمام تقاضے نبھاتا نظر آیا ہے۔ سانول نے محبت کی سچائی کے حصول کے لیے ہزار ہا جتن کیے۔ اپنوں کی مخالفتوں اور غیروں کے الطعنوں نے باوجود محبت کے رستے پر چلتا رہا۔ اس امید پر کہ کبھی منزل اس کا مقدر بنے گی۔ بہار اس نے شب و روز کو مہکائے کی۔ پھولوں سی تازگی اس کی زندگی کا حصہ ٹھہرے گی۔

مگر لکھے کو کون مال سکتا ہے۔ سانول نے محبت کو حاصل کرنے کے لیے در بدر کی ٹھوکریں کھائیں۔ اسے محبت کے جرم میں دیس نکالا ہوا۔ برسوں کا نول بھری راہوں پر چلتا رہا۔ اس کے دوست حق دوستی کے تقاضے پورے کرتے دکھائی نہ دیے۔ کنارے پر کھڑے ہو کر اسے غم کے بحر میں غرقاب ہوتے دیکھتے رہے۔ رہی سہی کسر شمرین نے پوری کر دی۔ اس نے ساتھ نبھانے کے وعدے کیے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں۔ رسوائیوں کی تندہوا کیا چلی وہ ڈانواں ڈول ہو گئی۔ اس محبت سے منکر ہونے لگی جو اس کے دل میں دھڑکنوں کی طرح تھی۔ برسوں کی ریاضت سے تعمیر کیا ہوا تاج محل ایک لمحہ میں گرا دیا۔ خود مجبور یوں کی آڑ لے کر کسی اور کا گھر بسانے چل دی۔ یہ سوچے بغیر کہ پیچھے رہ جانے والے کی زندگی پر کیا بیتے گی؟ اس کے یک طرفہ فیصلے نے سانول کے تمام خواب چکنا چور کر دیے۔ اس نفسا نفسی کے دور میں سانول نے شمرین کو بہتر طریقے سے وداع کیا۔ خود برباد ہو گیا۔ مگر شمرین کی زندگی سنواری۔ سانول کئی سال تک دکھ کی بدترین کیفیت میں رہا پھر اس کی ویران زندگی میں زرین آ گئی۔ جس محبت کی سچائی کی تلاش میں سانول مدتوں بھٹکتا رہا وہ زرین کی صورت مل گئی۔ تین سال زرین اس کی زندگی میں خیر و عافیت سے رہی پھر زلزلہ آ گیا۔ زلزلہ نے شہروں کے شہر گرا دیے۔ بالا کوٹ میں زلزلہ کی شدت سب سے زیادہ تھی بالا کوٹ میں شمرین کا گھر تھا۔ شمرین کی ماں اور بھائی زلزلہ کی نذر ہو گئے شمرین بچ گئی مگر دونوں ٹانگوں سے معذور ہو گئی سانول نے اسے تلاش کیا اس کا سہارا بنا اسے ہمیشہ کے لیے شریک حیات بنایا۔ سانول کے جذبہ محبت کو دیکھتے محسوس کرتے ہوئے آنکھیں اشکبار ہوئیں..... آخر میں اتنا ہی کہہ سکتی ہوں ”عشق زیر، عشق زبر“ موجودہ ادبی بحران میں ایک اچھا اضافہ ہے جو پڑھنے والوں پر اپنے دیرینہ اثرات چھوڑے گا۔

گاؤں کی جنوبی طرف بڑی نہر تھی، نہر کی طرف سے جو گاؤں کو بڑی سڑک آتی، اس سڑک کے دائیں بائیں کیکڑ، ٹاہلی (شیشم) اور بیری کے پیڑ تھے، گاؤں کے قریب آ کر سڑک جہاں سے مڑتی وہاں دائیں بائیں سرکنڈوں کے بوٹے تھے، گاؤں کے شروع میں دائیں طرف چوہدری کریم کا گھر تھا، اس کے گھر کے آگے کری کے دو درخت تھے، بائیں طرف محمد یار کا گھر تھا، اس گھر کے ساتھ ہمارا گھر تھا، گھر کیا ایک کچا کوٹھا تھا، ساتھ ایک سرکنڈوں کی جھگی، صحن کھلا تھا، صحن میں ایک کیکڑ کا درخت تھا، ہمارے گھر کے شمالی طرف نور حسن کا گھر تھا، مشرقی طرف ہمارے نانا عطا محمد کا گھر تھا، ہمارا گھر بڑی سڑک کے ساتھ تھا، گھر کا بیرونی دروازہ نہ تھا، ہمارے نانا عطا محمد کا بھی کچا گھر تھا، ہمارا گھر کچھ اونچائی پر تھا جبکہ بڑی سڑک کچھ نشیب میں تھی، ہمارے گھر کی پچھلی طرف جگہ خالی تھی، یہ دو اڑھائی ایکڑ کے لگ بھگ تھی، جب بارش ہوتی تو نشیبی سڑک کھالے (نالے) کا روپ دھار لیتی، نشیبی جگہ پر جو ہڑ بن جاتا، کئی کئی دن پانی کھڑا رہتا، ہمارا گھر چار افراد پر مشتمل تھا، ماں سیکہ بی بی، بڑا بھائی کبیر، چھوٹا بھائی صغیر، سب سے چھوٹا میں تھا، بڑے بھائیوں کی طرز کا نام رکھنے کی بجائے ماں نے میرا نام سانول رکھا۔

ہمارے گھر میں ایک گائے، ایک اس کا پچھڑا، تین بکریاں اور کچھ مرغیاں تھیں، کچے کوٹھے میں تین چار پائیاں اور ایک رتڑا پلنگ تھا، اس رتڑے پلنگ پر ماں نے مجھے

جنم دیا..... مجھے کچھ پتا نہ تھا کہ باپ کیا ہوتا ہے! بس مجھے اتنا یاد ہے اس وقت میری عمر تین ساڑھے تین سال کی تھی رات کا وقت تھا ہمارے گھر ایک جیپ آئی اس میں ہمیں بٹھایا گیا میں نے زندگی میں پہلی بار جیپ دیکھی تھی میں اس میں بیٹھ کر بہت خوش تھا جیپ چلی تو مجھے اور خوشی ہوئی تھی..... جیپ میں ماں اور دونوں بڑے بھائی بیٹھنے کے بعد رونے لگے تھے مجھے اتنی سمجھ نہ تھی کہ وہ کیوں رورہے ہیں میں جیپ میں بیٹھ کر خوش تھا باہر اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اس کے باوجود میں خوش تھا یہ وہ جیپ تھی جس کے ساتھ میرے باپ کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا صبح کے وقت ہم اس جیپ سے اترے جس گھر میں پہنچے اس میں عورتوں اور مردوں کا رش تھا تمام ایک چارپائی کے ارد گرد بیٹھے رورہے تھے میری ماں بھی ان کے بیچ بیٹھ کر رونے لگی تھی۔ میں ان روتی عورتوں کو دیکھ کر سہا ہوا تھا اس کے بعد مجھے ایک چارپائی پر سلا دیا گیا پھر مجھے اتنا یاد ہے کہ ہم واپس اپنے گھر آ گئے۔ ڈیڑھ سال کے بعد مجھے علم ہوا جس جیپ میں بیٹھ کر ہم ان روتی عورتوں کے پاس گئے وہ ہمارے باپ کا گھر تھا جس جیپ میں بیٹھ کر گئے اس جیپ کے ساتھ ایکسیڈنٹ میں میرا باپ مرا یہ تحصیل دار کی جیپ تھی۔ ساڑھے چار سال کی عمر میں میں ماں سے بہت الٹ پلٹ سوال پوچھنے لگا تھا کہ مینی لیاقتی طاہری کا باپ کب مرے گا؟ وہ کب جیپ میں بیٹھیں گے؟ ماں مجھے ایسے سوالوں پر ڈانٹتی جب سوال پوچھنے سے پھر بھی باز نہ آتا تو کبھی کبھی مار بھی دیتی۔

گاؤں میں ایک چاچا فوتو تھا جس سے گاؤں کے تمام بچے ڈرتے تھے وہ بچوں کو زبردستی اسکول بھجواتا تھا اس کا کام ہی یہی تھا روز لوگوں کے گھر جانا ان کو سمجھانا کہ اپنے بچوں کو اسکول بھیجو ان کو علم کی روشنی سے محروم نہ رکھو گاؤں کے کئی بچے اس کی کوششوں سے اسکول تک پہنچے وہ ہمارے گھر بھی آتا ماں کو کافی سمجھاتا۔ میرا بڑا بھائی کبیر اس کی ناصحانہ باتوں پر بہت ہنستا چاچا فوتو کا مذاق اڑاتا تھا۔ دونوں بڑے بھائی

اسکول تک نہ پہنچ پائے وہ چھوٹی عمر میں ہی چوہدری کریم کی زمینوں پر محنت مزدوری کرنے لگے تھے۔ انہوں نے مجھے اسکول کے متعلق کافی ڈرایا ہوا تھا، مجھے اسکول کے نام سے ہی خوف آتا تھا۔ میں دونوں بھائیوں کی ہر بات مانتا، وہ جو کام کہتے، میں کرتا تھا۔ انہوں نے مجھے اسکول کے بارے میں اس طرح ڈرایا تھا کہ مجھے ان کا ہر کام کرنا پڑتا، چارے کے حصول کے لیے ان کے ساتھ کھیتوں میں جانا..... بکریوں کو پانی پلانا، گائے اور بکریوں کے آگے چارا ڈالنا، مرغیوں کا خیال رکھنا کہ وہ کب انڈہ دیں گی؟ جونہی کوئی مرغی انڈہ دیتی، میں اٹھا کر اپنے بھائیوں کو پیش کر دیتا۔ چھوٹی عمر میں ہی مجھے یہ تمام کام کرنے پڑے تھے، وہ جو کام کہتے مجھ سے انکار نہ ہوتا، مجھے ڈر تھا کہ اگر میں انکار کروں گا تو وہ مجھے اسکول چھوڑ آئیں گے۔ ماں ہمیں روٹی کھلا کر محنت مشقت کے لیے چوہدری کریم کے کھیتوں میں چلی جاتی، میں نے ماں کے ہاتھ میں زیادہ داتری (دراختی) دیکھی، گرمی کے موسم میں گندم کاٹتی، سردی کے موسم میں روں (کپاس) چلتی، وہ اس طرح محنت مشقت نہ کرتی تو ہم بھوکے مرتے۔

ایک دن یوں ہوا ماں صبح روٹیاں پکا کر، ہمیں کھلا کر داتری لے کر گندم کاٹنے چلی گئی، گھر میں دونوں بڑے بھائی اور میں تھا، بڑا بھائی شہر دیکھ آیا تھا، شہر ہی نہیں کوئی فلم بھی دیکھ آیا تھا، وہ ہمیں اس فلم کی اسٹوری سنا رہا تھا کہ چاچا فتو موت کے فرشتے کی طرح نازل ہو گیا، اسے دیکھتے ہی بڑے بھائی نے مجھے اٹھایا اور کوٹھے میں داخل ہو گیا۔ ساتھ چھوٹا بھائی بھی تھا۔ انہوں نے جلدی سے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی، مجھے بڑے بھائی نے رتے (رنگین) پلنگ پر لٹا دیا، اوپر ترپڑ (لحاف) ڈال دیا، میں کافی ڈر رہا تھا۔ دونوں بھائی دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے، چاچا فتو باہر سے چلا رہا تھا کہ دروازہ کھولو۔ میرے بھائیوں نے دروازہ کہاں کھولنا تھا؟ انہوں نے تو دروازے کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا، باہر چاچا فتو میرے بارے میں کافی کچھ کہہ رہا تھا

کہ اس کو تو اسکول جانے دو اسے علم کی روشنی سے محروم نہ رکھو خود نہ پڑھو اسے تو پڑھنے دو۔ میرے بھائی خاموش دروازے کو پکڑے، کھڑے تھے۔ چاچا فتو باہر کھڑا کافی کچھ کہہ رہا تھا اور میرے بھائی یوں چپ تھے۔ جیسے انہیں کچھ سنائی نہ دے رہا ہو۔ میں کافی سہا ہوا تھا۔ تھک بار کر چاچا فتو واپس چلا گیا۔ تو میری جان میں جان آئی۔ جب تک چاچا فتو باہر کھڑا رہا مجھے ڈر لگتا رہا کہ کہیں بھائی مجھے چاچا فتو کے حوالے نہ کر دیں۔ چاچا فتو چاچا تھا اس کے باوجود بھائی دروازہ نہ کھول رہے تھے کافی دیر کے بعد جب انہیں یقین ہو گیا کہ چاچا فتو واقعی چلا گیا ہے تب انہوں نے دروازہ کھولا۔ مجھے ترپڑ سے نکالا، ہم دوبارہ باہر صحن میں پڑی چارپائی پر آکر بیٹھ گئے بڑے بھائی نے دوبارہ فلم کی اسٹوری سنائی شروع کر دی۔ اس دن کے بعد مجھے چاچا فتو سے بہت ڈر لگنے لگا، میں زیادہ تر اپنے بھائیوں کے ساتھ رہتا۔

ایک رات پھر چاچا فتو ہمارے گھر آ گیا، میں نے اس کی آواز سنی تو ترپڑ میں چھپ گیا۔ سردی کا موسم تھا ماں اور بھائی اندر بیٹھے تھے میں ترپڑ میں ذرا بھی نہ بل رہا تھا۔ سویا ہوا ظاہر کر رہا تھا، ماں چاچا فتو کی بہت عزت کرتی تھی، ماں نے اسے بیٹھنے کی جگہ دی بیٹھنے کے بعد چاچا فتو نے اس دن کی تمام روداد سنائی، میرے بڑے بھائی چپ تھے، ماں چاچا فتو کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔ میرے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی، وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا، چاچا فتو نے میرے اسکول جانے کی بار بار بات کی کہ اسے ہر صورت اسکول بھیجو۔ ان جابلوں کے ساتھ یہ بھی جابل رہ جائے گا، ماں نے چاچا فتو سے کہا کہ کل میں ہر صورت چھوٹے کو اسکول داخل کرو آؤں گی..... بڑے بھائیوں کی ایک نہ چل رہی تھی، دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ چاچا فتو اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر چلا گیا، اس کے جانے کے باوجود میں سہا ہوا تھا کہ اب ہر صورت اسکول جانا پڑے گا، اب بھائیوں کا کوئی بہانہ نہ چلے گا۔

اگلے دن ماں نے جلدی، جلدی روٹیاں پکائیں..... میرے ہاتھ اور میرا منہ دھویا، مجھے نئے کپڑے پہنائے۔ دونوں بھائی مجھ سے آنکھیں چرا رہے تھے وہ میرے لیے کچھ نہ کر سکے تھے۔ روٹی کھلانے کے بعد ماں نے مجھے اٹھایا اور اسکول کی جانب چل پڑی۔ رستے میں کبھی ماں اٹھالیتی، کبھی میں ساتھ چلنے لگتا۔ میری انگلی ماں کے ہاتھ میں تھی۔ اس وقت میری عمر ساڑھے چار یا پانچ سال کے لگ بھگ تھی، مجھے اسکول گاؤں سے کافی دُور لگا، نہر کے ساتھ اسکول تھا، میں پہلی بار اسکول کو دیکھ رہا تھا، ماں نے اسکول کے قریب مجھے اٹھالیا، جوں جوں اسکول قریب آ رہا تھا، میرا خوف بڑھتا جا رہا تھا..... آخر ماں مجھے اسکول میں لے کر داخل ہوئی۔ ماسٹر صاحب کرسی پر جبکہ تمام بچے نیچے ٹائٹوں پر بیٹھے تھے۔ ماسٹر صاحب کے سامنے ایک چھوٹی سی میز، میز کے اوپر ایک رجسٹر اور ساتھ ایک ڈنڈہ پڑا تھا۔ اس ڈنڈے کو دیکھ کر مجھے اور ڈر لگنے لگا، ماں نے مجھے ماسٹر صاحب کے قریب اُتار دیا، ماسٹر مجھے دیکھ کر خوش ہوا، میں ٹائٹوں پر بیٹھے بچوں کو دیکھنے لگا۔ ان میں مینی، طاہری، لیاقتی اور باقی گاؤں کے لڑکے تھے..... تینوں کے ساتھ میں زیادہ کھیلتا تھا، تینوں میرے دوست تھے، تینوں آخری ٹاٹ پر بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر تینوں مسکرائے، مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ ماسٹر صاحب ماں سے خوش اخلاقی کے ساتھ بات کر رہے تھے، پھر انہوں نے رجسٹر نکالا، اس میں کچھ لکھنے لگے، مینی، لیاقتی، طاہری کو دیکھ کر میرا ذر کافی کم ہو گیا۔ ماسٹر نے ماں سے کہا، اسے سب سے پچھلے ٹاٹ پر بٹھا دو۔ ماں مجھے پچھلے ٹاٹ کی طرف لے آئی، اس ٹاٹ پر مینی، لیاقتی، طاہری بیٹھے تھے، میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔ ماں ماسٹر سے کچھ باتیں کرنے کے بعد واپس چلی گئی۔

ماسٹر نے تمام بچوں کو میرے متعلق بتایا کہ اب یہ روز تمہارے ساتھ اسکول آیا کرے گا، یہ تم سب سے چھوٹا ہے، اس لیے تم سب نے اس کا خیال رکھنا ہے، کل شہر سے میں اس کا قاعدہ لے آؤں گا، پھر ماسٹر بچوں کو پڑھانے لگے، میں مینی، لیاقتی، طاہری

کے ساتھ کھسک کھسک کرتا رہا۔ وہ لڑ بڑھنے لگے میں بھی ان کے قاعدوں پر پڑھنے لگا، اسکول میں میرا پہلا دن اچھا گزرا، چھٹی کے وقت ماں آ گئی..... اس دن ماں بہت خوش تھی..... واپسی پر تمام رستے مجھ سے پیار، محبت کی باتیں کرتی آئی۔ رستے میں اس نے مجھے سمجھایا کہ دل لگا کر پڑھنا، اگر تم دل لگا کر پڑھو گے تو بڑے ہو کر بڑے آدمی بنو گے۔ اس دن مجھے ماں کی باتیں اچھی لگیں۔

یوں میری زندگی میں اسکول آ گیا، اسکول میں مینی لیاقتی، طاہری میرے دوست تھے، ان میں سب سے زیادہ مینی میرا قریبی دوست تھا، لیاقتی نور حسن کا بیٹا، طاہری چوہدری کریم کا بیٹا اور مینی چاچا ذوالفقار کا بیٹا تھا، تینوں کے باپ اچھے تھے..... اپنے بیٹوں سے بہت پیار کرتے تھے، لیاقتی میرا ہمسایہ تھا۔ جب مینی یا طاہری میں سے کوئی نہ آتا تو میں کھیلنے کے لیے لیاقتی کے گھر چلا جاتا، میں اور لیاقتی مہر کی طرف جانے والی بڑی سڑک پر آ جاتے۔ جہاں سڑک کے ساتھ بیروں کے بیڑے تھے، ہمارے قدم وہاں آ کر رکتے..... پہلے ان بیروں سے بیر اتارتے، جب بیر کھا کھا کر دل بھر جاتا تو بڑی بیڑی کے نیچے بیٹھ جاتے۔ بارہ بیٹی کھیلنے لگتے، جب بھوک لگنے لگتی تب ہم گھر آ جاتے۔ گرمیوں کی راتوں میں ہم سب مل کر لٹک چھپ (آنکھ چوٹی) کھیلتے، رات گئے تک تمام گھروں میں بھاگتے پھرتے..... جس گھر میں چاہتے چلے جاتے، کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ چھپنے کے لیے جس گھر میں داخل ہوتے، اس گھر کے افراد ہمیں چھپانے کا خود بندوبست کرتے۔ چاندنی راتوں میں ہم وانجو (گاؤں کا ایک روایتی کھیل) کھیلتے۔ گاؤں کی شمالی طرف سیم زدہ چٹیل میدان میں وانجو بنایا جاتا..... گاؤں کے بڑے لڑکے ہمیں کچھلی گھوریوں (کھڈوں) پر کھلاتے..... ہم کچھلی گھوریوں پر رودے (جھوٹ) مارتے۔ رودوں کی پاداش میں گاؤں کے بڑے لڑکے ہمیں گھوریوں سے نکال دیتے۔ ہم چھ سات چھوٹے لڑکے وانجو کے گراؤنڈ سے کچھ دور اکٹھے بیٹھ کر ایک دوسرے کو

جنوں، پریوں، دیوؤں کی کہانیاں سناتے۔ وہ کہانیاں جو ہمیں ہماری مائیں سناتی تھیں۔
 دن کے وقت اسکول سے چھٹی کے بعد پہلے گھر آتے، جلدی جلدی روٹی کھاتے،
 روٹی کھانے کے بعد گھر سے نکل جاتے، مائیں پیچھے پکارتی رہ جاتیں، ہم ان کی آوازوں
 سے دُور نکل آتے، گاؤں کے مشرقی نلّو (کونے) پر کچی مسجد کے ساتھ فرواں کا درخت
 تھا، ہم سب اس کے نیچے آ جاتے، فرواں کے درخت کے ساتھ ایک کھجور کا پیڑ تھا، اس
 سے کچھ آگے ایک نیم کا درخت اور اس کے ساتھ ایک کیکر کا درخت تھا جو آدھا جھکا ہوا
 تھا، طوفان نے اسے آدھا نیچے جھکا دیا تھا، کچی مسجد کے صحن میں نکال لگا ہوا تھا، اس کا پانی
 بہت کھارا تھا، ہم مجبوری کی حالت میں اس نلکے کا پانی پیتے..... ہمارا اصل ٹھکانہ فرواں کا
 درخت ہوتا۔ ہم اس کے نیچے نلّو (کانچ کی گولیاں) باند رکھا اور بل کا گٹرا کھیتے۔
 عصر کے وقت تک ہم فرواں کے نیچے کھیتے رہتے۔ کچی مسجد کے پاس کھڑے ہو کر سیم
 زدہ چٹیل میدانوں کی جانب دیکھتے تو دُور دُور تک دھوپ اور سیم کے سوا کچھ دکھائی نہ
 دیتا۔ دُور کھجور کے تین چار بیڑ نظر آتے یا سرکنڈوں کے تھوڑے تھوڑے جھنڈ دکھائی
 دیتے۔ چٹیل میدانوں میں سیم کی وجہ سے کہیں کہیں جو ہڑ بنے ہوئے تھے..... ان
 جو ہڑوں میں آبی پرندے تیرتے نظر آتے..... ان میں زیادہ تر بگلے اور مرغابیاں ہوتیں،
 کچی مسجد سے کچھ آگے جو سب سے بڑا میدان تھا، شام کے وقت اس میدان میں، میں
 اور لیاقی نائیلون کے شاپروں کو ساڑ (جلا) کر بنائی ہوئی گیند کے ساتھ ہاکی طرز کا کھیل
 کھیتے، ایک طرف بڑا ڈنڈہ لے کر میں دوسری طرف لیاقی کھڑا ہو جاتا، ہم زور زور سے
 اس گیند کو ہٹ لگاتے۔ سورج ڈوبنے تک ہم اس طرح کا کھیل کھیتے رہتے، جب تھوڑا
 تھوڑا اندھیرا ہو جاتا تب ہم گھر آ جاتے۔ گھر آ کر میں صحن میں پڑی چارپائی پر لیٹ
 جاتا..... اس وقت ہمارے گھر کے اوپر سے بہت سے کوئے گزر رہے ہوتے..... شام
 کے بعد کے اندھیرے میں کوئی کوئی کوئی نظر آتا، میری آنکھوں کو ایک کوئے کا انتظار

ہوتا، اس کوے کے پیروں میں کسی نے گھنگھر و ڈال دیے تھے، جب وہ گزرتا تو گھنگھر کی آواز صاف سنائی دیتی..... کوے کے پاؤں میں ڈالے گھنگھر کی آواز اچھی لگتی تھی، جب کوہ گزرتا، میں چارپائی سے اٹھ پڑتا، گھرے سے پانی پیتا اور چولہے کی طرف آ جاتا، جہاں ماں ہمارے لیے روٹیاں پکانے میں مصروف عمل ہوتی۔

گھر میں ماں اور دونوں بڑے بھائی مجھے کا کا کے نام سے پکارتے جبکہ گاؤں کے تمام دوستوں میں میرا نام پہلو تھا..... میرا نانا عطا محمد میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی فوت ہو گیا تھا..... نانی، نانا سے کئی سال پہلے فوت ہوئی، نانی کی وفات کے بعد نانا نے دوسری شادی نہ کی..... اس گاؤں میں ہمارا کوئی رشتہ دار نہ تھا..... ماں کے علاوہ ہمارا اور کون تھا، مجھے اس کا علم نہ تھا..... میری زندگی میں ماں کے بعد اسکول آچکا تھا۔ میں ماں کی نصیحت پر عمل کر رہا تھا۔ پہلی جماعت میں ہی دل لگا کر پڑھنے لگا تھا..... اسکول میں جب پہلی جماعت کا امتحان ہوا تو میں نے سلیٹ پر جمع، تفریق، ضرب کے تمام سوالوں کے ٹھیک جواب لکھے۔ ماسٹر شکور نے جتنے زبانی پوچھے، تمام کا صحیح جواب دیا، باقی لڑکوں کے کئی سوال غلط ہوئے، جب نتیجہ اگلا میں تھرڈ آیا تھا، طاہری فرسٹ اور مینی سیکنڈ آیا..... حالانکہ دونوں نے کئی سوال غلط لکھے، طاہری چوہدری کریم کا بیٹا تھا اور مینی چاچا ذوالفقار کا، دونوں کی گاؤں میں سب سے زیادہ زمینیں تھیں۔ اس دن مجھے ماسٹر شکور اچھا نہ لگا، اس دن مجھے دکھ ہوا۔ چھٹی کے بعد میں چُپ کر کے اسکول کے دوستوں کے ساتھ گھر آیا، اس دن مجھے چاچا فتو اچھا نہ لگا، میں نے اس پر سوچا تو مجھے ایسے محسوس ہوا کہ میری جو تھرڈ پوزیشن آئی ہے، اس میں چاچا فتو کا ہاتھ ہے۔

شام تک میں سب کچھ بھول گیا، رات کو ہم سب دوست مل کر چھپن چھپائی کھیلے..... جب کبھی اسکول سے چھٹی کے بعد کوئی دوست نہ ملتا، میں اکیلا ہی کچی مسجد کی طرف آ جاتا، فرواں کے نیچے کوئی نہ ہوتا تو میں آگے چٹیل میدان کی طرف چل دیتا،

سیم زدہ چٹیل میدانوں کی مشرقی طرف کچھ کچھ ہریالی تھی..... چٹیل میدانوں کے ساتھ ساتھ زیادہ تر جنت (ایک جنگلی پودا) اُگایا جاتا اس دن موسم بہت خوشگوار تھا آسمان سے بھوار گر رہی تھی اس دن مجھے کوئی دوست نہ ملا میں اکیلا ان سیم زدہ چٹیل میدانوں کی طرف آ گیا۔ جنت کے جھنڈ میں ایک بڑے سے پرندے کو اترتے دیکھا اتنا خوبصورت پرندہ میں نے پہلی بار دیکھا تھا جب میری نظر اس کے پروں پر پڑی تو میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا وہ پرندہ مور تھا..... اس کے کھنب (پَر) قرآن مجید میں دیکھے تھے سب سے کہتے سنا کہ یہ مور کے کھنب ہیں میں چھپتا چھپاتا جنت کے جھنڈ کے قریب آ گیا۔ مور مجھے نظر آ رہا تھا جنت کے جھنڈ میں نیچے سے سب نظر آتا تھا..... میں کوئی کھڑکا (آواز شور) کیے بغیر جنت کے جھنڈ میں نیچے بیٹھ چکا تھا مور کے خوبصورت کھنب مجھے صاف نظر آرہے تھے میرا دل لپچا رہا تھا مور کو پکڑنے کا منصوبہ بنا رہا تھا کہ مور کو میری موجودگی کا علم ہو گیا۔ اس نے پر کھولے اور اڑنے کے لیے تمام تر زور لگا دیا جونہی وہ جھنڈ سے نکلا میں اس کے پیچھے بھاگا اس کے کھنب میری پہنچ سے دور تھے اس نے نیچے اپنا ایک کھنب بھی نہ گرایا اس نے مجھے کوئی نشانی نہ دی اور میری پہنچ سے دُور نکل گیا۔ میں اس کے پیچھے کچھ قدم بھاگنے کے بعد رُک گیا مزید بھاگنا بے سود تھا۔ رکنے کے بعد غصے سے بڑبڑایا ابھی میں بہت چھوٹا ہوں اس لیے تمہارا بچ بچاؤ ہو گیا، تُو میرے ہاتھ سے نکل گیا جب میں بڑا ہو جاؤں پھر ادھر آنا پھر یوں اُڑ کر دکھانا۔ ایک کھنب مل جاتا تو تمام دوستوں کو مور کے متعلق بڑھا چڑھا کر بتاتا میرے ہاتھ کوئی نشانی نہ آئی اب اگر میں مینی لیاٹی طاہری کو بتاتا تو انہوں نے میرے کہے کو جھوٹ سمجھنا تھا واپس گاؤں آ کر میں نے کسی کو نہ بتایا کہ آج میں نے اپنی آنکھوں سے جنت کے جھنڈ میں مور دیکھا ہے۔

بچپن میں ہر کھیل اچھا لگتا ہے، اسکول سے چھٹی کے بعد ہم سارا دن کھیلتے۔ جس دن چھٹی ہوتی اس دن میرا بڑا بھائی کبیر مجھے اپنے ساتھ لے جاتا۔ ماکھو (شہد) اُتارنے کے لیے اسے میری اشد ضرورت پڑتی تھی، میں شہد اُتارتے وقت مکھیوں سے ذرا بھی نہ ڈرتا تھا۔ شہد لے چیتے کو گوبر کے اُپلوں سے دھواں دیتا، مکھیاں چھلی چھوڑ دیتیں، میں چھری سے چھلی کاٹ کر بالائی میں ڈال دیتا۔ اگر شہد کا چھتہ مشکل جگہ پر لگا ہوتا تو دراتی یا کلبھاری سے وہ جہنی کاٹ دیتا، میں شہد ضائع نہیں ہونے دیتا تھا، بڑا بھائی اس دن بہت خوش ہوتا، وہ مجھے شہد کا چھتہ دکھا دیتا۔ میں منٹوں میں اسے اُتار دیتا۔

گاؤں کی مشرقی طرف سیم زدہ جوہڑوں کے ساتھ ڈب (گھاس) کے کافی جھنڈ تھے، میں اور بڑا بھائی ڈب کے جھنڈ میں داخل ہو جاتے، جتنے ماکھو (شہد) لگے ہوتے اُتار لیتے، یہاں سے اُتارنے کے بعد نہر کی پڑی آ جاتے، نہر کی پڑی کچھ اونچی تھی، اس کے دائیں بائیں لیکر اور ٹالی کے درخت تھے، پڑی کی پٹلی جانب نہر کے ساتھ ساتھ سرکنڈوں کے کثیر تعداد میں جھنڈ تھے..... ان میں جہاں کھجور کے پیڑ ہوتے، وہاں ضرور شہد کے چھتے مل جاتے۔ ہم نہر کی پڑی پر چلتے ہوئے گاؤں سے دو میل دور آ جاتے..... سامنے نہر کے اوپر بنی گھوڑ پلی نظر آنے لگتی۔ اس گھوڑ پلی کے اوپر سے گزر کر ہم نہر کے پار چلے جاتے..... نہر کے پار سرکنڈوں کے جھنڈ کے علاوہ کریوں کے جھاڑی نمایاں بہتات سے تھے، کریوں کی جھاڑیوں میں کافی ماکھول جاتے، جوں جوں ہم آگے بڑھتے جاتے، ہندوستان کی سرحد نزدیک آتی جاتی، نہر سے سات آٹھ ایکڑ دور ہندوستان کی سرحد تھی، سرحد کے ساتھ ریت کے بچے تھے..... ان ٹپوں پر کوکن بیروں کے چھوٹے چھوٹے پیڑ تھے، ان پر چھوٹے چھوٹے سرخ بیر لگے ہوتے..... ان بیروں میں شہد کی طرح مٹھاس ہوتی۔ ان کے علاوہ پرم ڈنڈی کے بوٹے تھے، پرم ڈنڈی (جڑی بوٹی) کا شربت بنتا تھا جو گرمی کے مریضوں کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔ جو

پریم ڈنڈی کے شربت کو پی لیتا، وہ گرمی کی اکثر بیماریوں سے محفوظ رہتا۔ بڑا بھائی اور میں سرحد کے قریب چلے جاتے، ہم سے چند قدم آگے ہندوستان کی زمین تھی، جو بالکل ہماری زمین جیسی تھی، بڑا بھائی مجھے بہت ڈراتا، ہندوستان کی سرزمین کی طرف اشارہ کر کے کہتا۔

”کبھی ادھر نہ جانا، ادھر ان کے فوجی مورچوں میں چھپے ہوتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہی گولی مار دیتے ہیں۔ ہندو اور سکھ ہمارے دشمن ہیں۔“

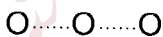
ہندو اور سکھ اپنی زمینوں پر کام کرتے نظر آتے، میں انہیں بڑے غور سے دیکھتا۔۔۔۔۔ وہ مجھے سر سے پاؤں تک انسان لگتے، ہمارے جیسے ان کے ہاتھ پاؤں ہوتے، ان کی فصلیں اور ہماری فصلیں ایک جیسی تھیں۔ پھر وہ ہمارے دشمن کس طرح سے تھے؟ ان کی زمینوں پر پریم ڈنڈی کی جھاڑیاں اور کوکن بیروں کے پیڑ تھے۔ اس کے باوجود وہ ہمارے دشمن تھے۔۔۔۔۔ بڑا بھائی کہتا۔ ”وہ کافر ہیں، ان کی طرف دیکھنے سے گناہ ملتا ہے۔“ بھائی کی باتیں سن کر میرے ننھے ذہن میں کئی سوال ابھرتے، لیکن میں ڈرتے ہوئے چپ رہتا۔۔۔۔۔ پاکستان اور ہندوستان کی سرحد ایک لکیر کی صورت تھی۔ لکیر کے اس پار جتنے انسان تھے وہ کافر اور ہمارے دشمن تھے،۔۔۔۔۔ کیسی دشمنی تھی؟ نہ ادھر والے ادھر جاسکتے تھے، نہ اُدھر والے ادھر آسکتے تھے، نہ ایک دوسرے سے ہاتھ پائی کر سکتے تھے۔۔۔۔۔ اس کے باوجود ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے، ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے، حالانکہ ان کی زمینیں ایک جیسی، ان پر اگتی فصلیں ایک جیسی تھیں۔۔۔۔۔ کیسی دشمنی تھی؟ میں ڈرتے ہوئے بھائی سے کوئی سوال نہ کرتا۔ شام کے وقت ہم گھر آتے، گاؤں میں اکثریت کچے گھروں کی تھی۔۔۔۔۔ چھوٹا سا گاؤں تھا نہر کی طرف سے آنے والی سڑک ہمارے گھر کے پیچھے سے گزرتی ہوئی گاؤں کے درمیان جا کر دو گلیوں میں تبدیل ہو جاتی۔ ایک مشرقی طرف دوسری مغربی طرف نکل جاتی، گاؤں کی

مشرقی مکر پر کچی مسجد اور مغربی مکر پر پکی مسجد تھی۔ گاؤں کے تمام کلین پکی مسجد میں نماز پڑھتے تھے۔ کچی مسجد میں کوئی نہ جاتا۔۔۔۔۔ وہ ویران ہو چکی تھی اور اس کے اندر مکر یوں نے جالے اور چھپکیوں نے گھر بنا لیے تھے۔ میں جب فرواں کے نیچے آتا اور کچی مسجد کی طرف دیکھتا تو سہم سا جاتا، مسجد کی ویرانی سے مجھے خوف محسوس ہوتا۔۔۔۔۔ میں سوچتا، گاؤں والے کچی مسجد میں نماز پڑھنے کیوں نہیں آتے؟ مسجد کے صحن میں مٹی ہے، اس کے اندر پڑی صفیں پھٹی ہوئی ہیں یا کوئی اور وجہ ہے؟

چوہدری کریم پکی مسجد میں نماز پڑھتا تھا شاید اسی لیے تمام گاؤں والے پکی مسجد میں جا کر نماز پڑھتے تھے۔۔۔۔۔ میں کچی مسجد کو دیکھ کر خود سے کہتا، جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو اس مسجد میں آکر نماز پڑھا کروں گا، اسے آباد کروں گا۔۔۔۔۔ میں جب بھی فرواں کے نیچے جاتا تو مسجد کی ویرانی کو دیکھ کر اتنا ضرور کہتا، گھر جا کر بھول جاتا۔ ہمارے گھر کی طرح دوسرے گھروں کے صحن بھی کھلے تھے، ان صحنوں میں ڈنگروں کی اکھڑیاں (ایک حوض ٹائپ کی چیز جس میں چارہ ڈالا جاتا ہے)، تھیں، گاؤں میں صرف ایک دکان تھی، اس کا نام ”حاجی کی ہٹی (دکان)“ تھا، یہ گاؤں کی مشرقی گلی میں تھی۔۔۔۔۔ حاجی ہم سے ایک کلاس آگے تھا، اس کا اصل نام سلیم تھا، وہ حج والے دن پیدا ہوا تھا، اس لیے سب اسے حاجی، حاجی کہتے تھے۔ اصل نام سے اسے کوئی نہ پکارتا تھا۔۔۔۔۔ ہم جو شہد اتار کر لاتے، بڑا بھائی بیچ دیتا تھا، کچھ پیسے مجھے بھی دے دیتا، میں پیسے لے کر اپنے دوستوں کے ساتھ حاجی کی ہٹی پر آتا، ہٹی سے ناگر (ایک قسم کی مٹھائی)، مکھانے، لڈو، پھلیاں خریدتا۔۔۔۔۔ جھولی میں ڈال کر دوستوں کو لے کر فرواں کے نیچے آ جاتا، فرواں کے نیچے بیٹھ کر ہم ناگر، مکھانے، لڈو، پھلیاں کھاتے، میں اکیلا کچھ نہ کھاتا تھا۔

کئی بار میں اور مینی شفقت کی بھینی (چھوٹی بستی) پر گئے، شفقت کی بھینی، گاؤں کی مشرقی طرف آدھے میل کے فاصلے پر تھی۔ بڑے کھالے کے ساتھ ان کا گھر تھا، گھر

کے صحن میں بیری کا ایک بڑا پیڑ تھا جو بیروں کے موسم میں بیروں سے لد جاتا۔ گھر کے باہر کھالے کے ساتھ ایک چھوٹا بیری کا پیڑ تھا جس کے بیر بہتے کھالے میں گرتے رہتے تھے۔ جب ہم شفقت کی بھینی پر جاتے تو شفقت ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوتا اور ہمیں اپنے گھر لے جاتا۔ اس کا باپ کم ہی گھر میں ہوتا تھا، گھر میں شفقت کی ماں اور بہنیں ہوتیں۔ شفقت کی ماں ہمیں اپنے گھر میں دیکھ کر خوش ہوتی، ہماری بلائیں لیتی۔ ہم کئی گھنٹے ان کے گھر میں رہتے۔ ہمیں کھانے کے لیے روٹی ملتی..... روٹی کے ساتھ پلیٹ میں مکھن ڈالا ہوتا..... ہم اس مکھن کے ساتھ روٹی کھاتے۔ جب ہم ان کے گھر سے آنے لگتے تو شفقت کی ماں ہمیں بہت سارے بیر دیتی جو ہم اپنی جھولیوں میں ڈال لیتے اور رستے میں کھاتے آتے۔ تین چار ایکڑ شفقت ہمارے ساتھ آتا پھر ہم اسے واپس بھیج دیتے۔ شفقت اسکول میں ہمارا دوست تھا، اسکول میں ہی ہمارے ساتھ کھیلتا تھا، اس کا گھر گاؤں سے دُور تھا اس لیے رات کے وقت وہ کھینے نہ آتا.....



گاؤں کی مغربی طرف جو سڑک نکلتی وہ سیدھی قبرستان کو جاتی تھی، گاؤں سے دس بارہ فرلانگ دُور گاؤں کا قبرستان تھا۔ قبرستان کے ساتھ ریت کا بہت بڑا ٹھہ تھا، اس ٹھہ پر سرکنڈوں کے یوٹے تھے۔ اس ٹھہ کے آگے سیم زدہ چٹیل میدان تھا، ٹھہ کافی اونچا تھا، اس کے اوپر چڑھ کر سیم زدہ چٹیل میدان دیکھنے سے بہت پُر اسرار لگتا تھا۔ دُور دُور تک کوئی درخت نہ تھا۔ چٹیل میدان میں کہیں کہیں جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں، جب کبھی گاؤں میں کوئی فوت ہوتا تو اس کی میت کے ساتھ ہم قبرستان آتے۔ قبرستان میں آنے کے بعد اونچے ٹھہ پر ضرور چڑھتے تھے۔ گاؤں والے میت کو دفنا کر واپس چلے جاتے تو ہم دوست ٹھہ پر کھیلتے رہتے۔ جب کھیل کھیل کر تھک جاتے تب ہم واپس گاؤں آتے۔ گاؤں کے گھروں میں نیم، کیکر، ٹابلی اور کھجور کے درخت تھے، ان درختوں کی بدولت

گاؤں دیکھنے میں کافی خوبصورت لگتا تھا، خاص طور پر نہر کی پٹری پر کھڑے ہو کر دیکھنے سے درختوں میں گھرا گاؤں خوبصورت نظر آتا تھا..... ہم گاؤں کے ہر گھر میں بلا جھجک چلے جاتے تھے لیکن ان گھروں میں نہیں جاتے تھے جن میں کتے ہوتے تھے۔

گاؤں میں اماں فیضان ہمیں سب سے اچھی لگتی تھی، ہمارے گھر سے دو گھر چھوڑ کر اس کا گھر تھا..... اس کا میاں (خاوند) فوت ہو چکا تھا۔ اس کی کوئی اولاد نہ تھی، وہ گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ ہم دوست جب لٹک چھپ کھیلنے تو اماں فیضان کے گھر ضرور چھپنے جاتے۔ اماں فیضان چھپانے سے پہلے ہماری بلائیں لیتی، ہم سے بہت پیار کرتی تھی۔ ہم سب سے زیادہ اماں فیضان کے گھر جاتے تھے۔ خورشید نائی کا گھر بھی ہمارے لیے محفوظ پناہ گاہ ثابت ہوتا تھا، اس کا گھر گاؤں کی شمالی کٹڑ پر تھا..... خورشید نائی کا چھوٹا بیٹا اشرف ہمارا دوست تھا اور ہمارے ساتھ کھیلتا تھا۔ وہ ابھی اسکول میں داخل نہ ہوا تھا..... مینی لیاقی، طاہری، اشرف، اماں فیضان کے گھر ہم بلا روک ٹوک داخل ہو جاتے۔ ان کے کوٹھوں، جھگیوں کے اندر چار پائیوں پر پڑے ترپروں اور رضائیوں میں چھپ جاتے۔ ان گھروں کا کوئی فرد ہمیں نہ روکتا، نہ ڈانٹتا، جس گھر میں چھپنے کے لیے ہم داخل ہوتے، اس گھر کے افراد ہمیں دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔

کمد کے موسم میں طاہری، مینی لیاقی کے کھیتوں میں بیلینے لگ جاتے، ہم خوب گنے پو پتے، بیلینے کے پاس بیٹھ کر گڑ کھاتے، گنے کے رو پیٹے، ہمیں کبھی کسی نے نہ روکا کہ کیا کھا رہے ہو؟ کیا پی رہے ہو؟ ہم شرارتیں بہت کرتے تھے، پر ہمیں کوئی بھی نہ ڈانٹتا تھا۔ میرے تینوں دوست اپنے اپنے گھر میں لاڈ لے تھے، میں ان کا دوست تھا۔ تینوں مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ ان کے کھیتوں میں بیروں کے پیڑ تھے، میروں کے موسم میں ہم ان پیڑوں سے بیر کھاتے۔ گاؤں کی مشرقی طرف شفقت کی بھینی سے کچھ آگے گاؤں کے زمیندار اللہ بخش کا آموں کا باغ تھا۔ آموں کے موسم میں باغ آموں سے

بھر جاتا۔ جب پیڑوں پر آم پک جاتے تو ہم باغ میں آتے۔ باغ کا مالک اللہ بخش باغ میں ہی ہوتا تھا، وہ ہمیں پکے آم کھانے کو دیتا، وہ ہم سے کوئی پیسہ نہ لیتا تھا۔ آم کے باغ کے ساتھ کچھ انار کے بھی پیڑ تھے، باغ سے آم کھا کر گاؤں کی طرف واپس آتے وقت کچھ انار بھی چوری چھپے توڑ لیتے تھے۔ ہم نہر کی پٹری پر چلتے ہوئے واپس گاؤں آتے، تمام رستے نہر میں وٹے پھینکتے آتے، وٹا پھینکنے کا جب مقابلہ ہوتا تو سب مجھ سے ہار جاتے تھے، میں نہر کے پار آسانی سے وٹا پھینک لیتا تھا۔ نہر کی چوڑائی ایک ایکڑ کے لگ بھگ تھی، وٹا پھینکنے کے مقابلے میں مجھ سے کبھی کوئی نہ جیت سکا، وٹے کو میرے ہاتھ سے نکلتے اور نہر کے پار جاتے دیکھ کر سب حیران ہوتے تھے۔

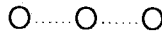
مجھے مچھلیاں پکڑنے کا بہت شوق تھا۔ بڑا بھائی شہر سے کنڈی ڈوریں لے آیا تھا، میں ایک کنڈی ڈور اٹھا کر نہر پر آ جاتا۔ گھر سے آنا اور رستے میں کھالے سے گڈوئے (کیچوے) بھی نکال لیتا، ان کو کنڈی کے ساتھ لگاتا اور اللہ کا نام لے کر ڈور نہر میں پھینک دیتا، تب تک گھر نہ آتا، جب تک کوئی مچھلی نہ پکڑ لیتا۔ شام ڈھلے تک تین چار مچھلیاں ضرور پکڑ لیتا تھا، نہر کی پٹری پر اسکول کی جانب تین مورچے بنے ہوئے تھے، ان مورچوں کا فرش پکا تھا۔ گاؤں کے لڑکے مورچوں کے فرش پر لٹو چلاتے تھے، لٹو چلانے والے لڑکے ہم سے بڑے تھے اور اگلی جماعتوں میں پڑھتے تھے۔ میں اور میرے دوست لٹو کو فرش پر چلتا دیکھ کر حیران ہوتے تھے۔ میرے دل میں بھی لٹو چلانے کا شوق پیدا ہو چکا تھا۔ ان دنوں میں دوسری جماعت میں تھا.....

مینی، لیاتی، طاہری شہر کی بہت باتیں کرتے تھے کہ شہر اتنا بڑا ہوتا ہے، وہاں اتنے لوگ اور اتنی دکانیں ہوتی ہیں۔ وہ تینوں اپنے اپنے باپ کے ساتھ شہر دیکھ آئے تھے، میں ابھی تک شہر نہ دیکھ سکا تھا۔ ایک دن اسکول سے چھٹی کے بعد جب میں گھر آیا تو آتے ہی ماں سے کہہ دیا کہ مجھے لٹو لے دو، میں لٹو لینے شہر تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ مینی

لیاتی، طاہری شہر دیکھ چکے ہیں میں بھی شہر دیکھنا چاہتا ہوں۔ ماں میری معصومانہ باتوں سے مسکرانے لگی تھی۔ پھر میں ایک دن ماں کے ساتھ شہر جا رہا تھا، میرے ذہن میں شہر کے متعلق بہت تجسس تھا۔ ایک میل پیدل چلنے کے بعد ہم ایک ویگن میں بیٹھے، اس ویگن نے ایک گھنٹے کے بعد ہمیں شہر پہنچا دیا۔ شہر کو دیکھ کر ایک بار تو میں ڈر گیا، شہر کے متعلق مینی 'لیاتی' طاہری ٹھیک ہی کہتے تھے کہ وہاں اتنی دکانیں اتنے لوگ ہوتے ہیں۔ ماں نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا، میں لوگوں کو دیکھ کر ڈر رہا تھا کہ اتنے لوگ کدھر سے آگئے؟ ماں نے گھر کا کچھ سامان خریدا بازار میں ماں کے ساتھ چلتے ہوئے میں دکانوں کو حیرت سے دیکھ رہا تھا، ماں نے مجھے ایک دکان سے لٹو لے کر دیا، میں لٹو کو اپنے ہاتھ میں پکڑے بہت خوش تھا۔ ماں نے کہا لٹو مجھے دے دو گاؤں جا کر لے لینا، پر میں نے ماں کو لٹو نہ دیا۔ میں نے لٹو کو ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ ہم شام کے وقت واپس گاؤں میں آئے تھے، لٹو میرے ہاتھ میں ہی تھا۔ میں جلد از جلد لٹو اپنے دوستوں کو دکھانا چاہتا تھا۔

مغرب کی اذان کے وقت دوستوں کو میں نے ان کے گھر جا کر لٹو دکھایا، تینوں میرے لٹو کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے، اگلے دن اسکول سے چھٹی کے بعد ہم گھر آئے، جلدی جلدی روٹی کھائی اور لٹو کو لے کر مورچے کی طرف آگئے۔ ہمارے پاس ایک ڈوری تھی، ہم چاروں کو صحیح لٹو چلانا نہ آتا تھا۔ اس دن شام تک ہم لٹو چلانے کے قابل ہو گئے تھے۔ پھر جب بھی ہمیں وقت ملتا، ہم لٹو لے کر مورچے پر آ جاتے، مورچے کے فرش پر لٹو چلاتے اور خوش ہوتے۔ کچھ دنوں کے بعد ہمارا لٹو سے دل اُکتا گیا، میں نے لٹو کو اپنے گھر کے کچے کوٹھے میں رتڑے پلنگ کے نیچے پھینک دیا۔ پھر ہم سب سے زیادہ لگڑاں (کانچ کی گولیاں) کھیلتے تھے۔ ہمارا اسکول انگریز کے دور کا بنا ہوا تھا۔ اس بلڈنگ سے آگے تار بابو کا گھر تھا، اس گھر میں ایک کمرہ ڈاک خانے کا تھا۔ تار بابو کے

گھر کے سامنے آم کے پیڑ تھے۔ ڈاک بنگلے کے چاروں اطراف جھلنڑی (پودے) باڑ کی صورت اُگی ہوئی تھی۔ ڈاک بنگلے کی کوئی دیوار نہ تھی، جھلنڑی باڑ کا کام دے رہی تھی.....



اسکول سے چار پانچ فرلانگ آگے نہر کے اوپر ایک بڑا ہیڈ تھا، اس ہیڈ سے نہر تین چھوٹی نہروں میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ مجھے اس ہیڈ کے اوپر سے گزرتے ہوئے بہت ڈر لگتا تھا..... ہیڈ کے اوپر سے کبھی اکیلا نہ گزرا..... مینی یا طاہری ساتھ ہوتا، نہر کے پار مینی اور طاہری کے رشتے دار رہتے تھے..... وہ رشتے داروں کے گھروں میں مجھے اپنے ساتھ لے جاتے۔ جب ہم ہیڈ کے اوپر سے گزرتے تو میرا دل کا پٹنہ لگتا، میں 'مینی اور طاہری کے درمیان ہو جاتا..... اوپر کو ابھرتے پانی کی چنگھاڑ سے میرا دل دہل جاتا تھا۔

ایک دفعہ میں اور طاہری صبح کے وقت اس کے رشتے داروں کے گاؤں گئے، ڈرتے ہوئے ہیڈ کے اوپر سے گزرے۔ اس دن طاہری نے مجھے اپنے رشتے داروں کا تمام گاؤں دکھایا۔ سب سے اونچے ریت کے ٹپے پر اس کی ماسی کا گھر تھا، میں اور طاہری سارا دن اس گھر میں رہے..... اس کی ماسی کا گھر دو کچے کوٹھوں پر مشتمل تھا۔ مجھے ان کا گھر بہت خوبصورت لگا تھا، اونچے ٹپے پر ہونے کی بنا پر ان کے گھر کے باہر سے تمام گاؤں نظر آتا تھا..... طاہری کی ماسی کے گھر سے ہندوستان کی سرحد پانچ چھ فرلانگ دور تھی۔ ہندوستان کے علاقے پر دور دور تک نظر پڑتی تھی۔ ان کی زمینوں پر اُگے درخت اور کام کرتے، ہندو، سکھ نظر آتے تھے۔ ٹپے کے اوپر سے ہندوستان کا علاقہ کافی نشیب میں دکھائی دیتا، ہر چیز صاف نظر آتی تھی، ٹپے کے اوپر کھڑے ہو کر دیکھنے سے ہندوستان کی زمینوں پر اُگے درخت اور فصلیں بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔

ہم شام کے وقت ہیڈ سے گزر کر اپنے گاؤں آئے تھے۔ جہاں ہیڈ تھا، اس سے آدھا میل آگے پیر ظاہر شاہ کا مزار تھا، اس کے مزار پر ہر سال میلہ ہوتا تھا۔ میلے میں کافی رش ہوتا تھا، گرمی کے موسم میں یہ میلہ ہوتا تھا۔ میلے سے ہم قلیاں اور بیٹھے گلاس پیتے، شام کے وقت کبڈی اور گشتی ہوتی۔ پہلے روایتی گشتی ہوتی پھر کبڈی کا کھیل کھیلا جاتا، خوب ہلاکلا ہوتا، جب اندھیرا بڑھنے لگتا، تب ہم واپس گاؤں آتے تھے۔ مجھے گاؤں کا ایک ایک گھریا تھا، ان گھروں کے تمام افراد کو میں پہچانتا اور جانتا تھا..... چھوٹی عمر میں ہی مجھ میں کافی سمجھ بوجھ آچکی تھی۔ جس دن کھیلنے کو کوئی دوست نہ ملتا اس دن تیلیوں سے دوستی ہوتی، رات کو جگنوؤں سے۔ اس عمر میں سب سے زیادہ خدا سے ڈرتا تھا۔ میرے ہاتھ سے کوئی تیلی یا جگنو، پرندہ یا کوئی کیڑا مکوڑا مر جاتا تو میرا حال پتلا ہو جاتا، ایسے لگتا جیسے خدا ماسٹر شکور کی طرح مجھے ڈنڈے سے مارے گا۔ بچپن کے تمام دوست اپنے اپنے باپ سے ڈرتے تھے، میں خدا سے ڈرتا تھا۔

گرمی کے موسم میں رات کو مجھے کافی دیر تک نیند نہ آتی، میں چارپائی پر پڑا آسمان کو دیکھتا رہتا..... اس عمر میں ہی چاند ستاروں پر غور و فکر کرنے لگا تھا، ٹٹماتے ستارے میری آنکھوں کو سندر لگتے، چاند ستاروں کو دیکھ کر میں سوچتا کہ خدا کتنا خوبصورت ہوگا جس نے اتنے خوبصورت چاند اور ستارے بنائے۔ میں چاند کو دیکھتے، دیکھتے سو جاتا تھا..... ہر ماہ چودھویں کی رات کو دوسرے گاؤں سے فلک شیر آتا تھا۔ اس رات گاؤں کے تمام بوڑھے جوان نور حسن کے گھراکٹھے ہوتے اور تمام رات فلک شیر ہیر سناٹا۔ اس کی آواز میں بہت درد تھا، تمام رات ہیر گائی جاتی، سب ذوق و شوق سے سنتے۔ ہم گاؤں کے چھوٹے لڑکے کچھ وقت ہیر سنتے اور اکتا کر اٹھ جاتے اور لُٹھک چُھپ کھیلنا شروع کر دیتے۔

بڑی نہر کا پانی صبح کے وقت چمکتا تھا، مچھلیاں، اچھل، اچھل کر اٹھیلیاں کرتی

تھیں۔ صبح کے وقت نہر کا نظارہ بہت فسوں خیز ہوتا، رات کے وقت چاند ہر گھر میں دیکھنے سے سندر لگتا، گاؤں کے اطراف میں زمینوں پر اُگے کیکر، نیم، بیر، شیشم، فرواں، سوڑے اور کھجور کے درخت چاند کی مقدس روشنی میں بہت خوبصورت لگتے۔ چاند کی مقدس روشنی میں خدا کی بنائی کائنات نکھری نکھری سی لگتی۔ رات کو جب میں چاند ستاروں کو دیکھتا تو مجھے ایسے لگتا جیسے مجھے ان سے محبت ہو چکی ہے۔ چاند ستاروں کو دیکھنے کے بعد میں سب سے زیادہ خدا پر سوچتا تھا..... مچھلی کے علاوہ مجھے پرندوں کے شکار کا بھی شوق تھا۔ ایک غلیل بنائی ہوئی تھی۔ میرا نشانہ کافی اچھا تھا۔ غلیل سے کئی پرندے گرائے..... جب کوئی پرندہ گرتا تو میں ڈرتے ہوئے اٹھتا، میرے ذہن پر خدا سوار ہوتا، مجھے خدا سے ڈر لگنے لگتا..... گرے پرندے کو اٹھانے کے بعد مجھ پر سوگواریت کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ مرے پرندے کو زمین میں دبا کر کچھ دیر مٹی کے چھوٹے سے ڈھیر کے پاس بیٹھا رہتا پھر اٹھتے ہوئے ڈکھ سے آسمان کی طرف دیکھتا اور بڑبڑاتا، اے خدا! گاؤں کے تمام لڑکوں کے باپ ہیں، سب کا ایک ایک باپ ہے، میرا ایک باپ بھی نہیں..... واپس گھر آتے ہوئے تمام رستے میں خدا سے یہی سوال پوچھتا آتا..... مجھے اس سوال کا کبھی جواب نہ ملا..... جس پر مجھے بہت غصہ آتا تھا اور میں غلیل سے پرندوں کو گراتا تھا..... پرندوں کو صرف گراتا تھا، کھاتا نہیں تھا۔ مجھے پرندوں کو ذبح کرنا نہیں آتا تھا، مچھلی ذبح نہیں کرنی پڑتی تھی، اس لیے اسے کھا لیتا تھا۔

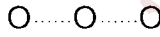
بڑا بھائی کبیر فلموں کی بہت اسٹوریاں سناتا تھا، میرے دل میں فلم دیکھنے کی آرزو پیدا ہو چکی ہے، میں سوچتا جیسی اسٹوریاں بھائی سناتا ہے، ویسی فلمیں کیسے بن سکتی ہیں؟ ایک دیوار پر زندہ انسان گھوڑے کیسے دوڑا سکتے ہیں؟ کیسے گنڈا سے اور گولیاں چلا سکتے ہیں؟ بندوق کا رخ کسی دیکھنے والے کی طرف بھی تو ہو سکتا ہے..... بڑے بھائی نے جتنی فلموں کی اسٹوریاں سنائیں، مجھے تمام اسٹوریاں یاد تھیں۔ ان فلموں میں سلطان

اوپر بیٹھنے کا کہا، میں خاموشی سے ریت کے اوپر بیٹھ گیا۔ میرے ساتھ بھائی بیٹھ گیا، سامنے ایک سفید اسکرین نظر آرہی تھی، سب لوگ اس کی طرف دیکھ رہے تھے، میں بھی دوسروں کی دیکھا۔ دیکھی اس اسکرین کی طرف دیکھنے لگا۔

چند منٹوں کے بعد فلم شروع ہوگئی، جونہی فلم شروع ہوئی میں بھائی کے ساتھ لگ گیا، پہلا سین ہی گھوڑوں کا تھا، گھوڑوں پر بیٹھے آدمیوں نے اپنے چہروں پر ڈھانٹے باندھے ہوئے تھے، ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ گھوڑے سرپٹ بھاگ رہے تھے مجھے ایسے لگ رہا تھا، گھوڑے ہال میں بیٹھے لوگوں کی طرف آجائیں گے، پھر گولیاں چلنے لگیں، ایک گھوڑا سوار نے ہال کی طرف بندوق کی توڑ سے میں بھائی کے ساتھ لپٹ گیا۔ بھائی نے مجھے پیار سے تسلی دی کہ کچھ نہیں ہوگا، ساتھ تھوڑا سا ہنسنا بھی ہنستے ہوئے بولا فلم دیکھنے کا تمہیں بہت شوق تھا، اب دیکھو۔ میں ڈر رہا تھا کہ گھوڑا سوار کے ہاتھ میں پکڑی بندوق چل ہی نہ جائے، میں اس کی سیدھ میں بیٹھا تھا، پھر بندوق سے گولی چلی، میں نے آنکھیں بند کر لیں، جب کھولیں تو سین بدل چکا تھا۔ اب اسکرین پر ایک خوبصورت عورت آچکی تھی، جو ایک مونچھوں والے مرد کے ساتھ پیار بھری باتیں کر رہی تھی، کچھ منٹوں کے بعد وہ عورت خوشی سے ناپنے لگی۔ مونچھوں والا مرد اس کے ساتھ چوڑا ہو کر چل رہا تھا، وہ مرد اقبال حسن تھا، اس فلم کا ہیرو جبکہ ہیروئن آسیہ تھی، پھر چلتی چلتی فلم بند ہوگئی۔ فلم میں وقفہ آ گیا تھا، بھائی مجھے بٹھا کر باہر چلا گیا، کچھ دیر کے بعد آیا، وہ باہر سے سمو سے لے آیا، ہم دونوں بھائی سمو سے کھا رہے تھے کہ فلم دوبارہ شروع ہوگئی، فلم میں وقفے وقفے سے گولیاں اور لاٹھیاں چلتی رہیں، جب فلم ختم ہوئی، بھائی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، سینما گھر سے واپس آتے ہوئے میں بہت خوش تھا، میں نے فلم اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تھی، گھر میں بھائی جس کی اسٹوری سناتا تھا۔

شادی والے گھر میں ہم دو دن رہے، جب ہم شہر سے واپس آ رہے تھے تو راستے

کا ہر منظر مجھے اچھا لگ رہا تھا، لیکن اپنی رفتار سے چل رہی تھی، میں چاہتا تھا کہ لیکن تیز چلے، میں جلدی گاؤں پہنچوں اور مینی لیاٹی، طاہری کو فلم کی اسٹوری سناؤں۔ شام کے وقت ہم گاؤں پہنچے سفر کی تھکاوٹ کے باوجود میں گھر میں ایک پل نہ ٹھہرا۔ تینوں دوستوں کو تلاش کر کے انہیں کچی مسجد کی طرف لے آیا، کچی مسجد کی پچھلی طرف بیٹھ کر میں نے ان کو فلم کی اسٹوری بڑھ چڑھ کر سنائی۔ مینی لیاٹی، طاہری ہمہ تن گوش ہو کر فلم کی اسٹوری سن رہے تھے، ان کے دلوں میں حسرت تھی، ان میں سے کسی نے بھی ابھی تک فلم نہ دیکھی تھی۔ میں فلم دیکھ کر آیا تھا، تینوں مجھ سے فلم کے متعلق عجیب عجیب سوال کر رہے تھے۔ میں فوراً ان کے سوالوں کا جواب دے رہا تھا، شام کے بعد جب اندھیرا ہو گیا تو ہم کچی مسجد کے پیچھے سے اٹھ کر اپنے اپنے گھروں کو آ گئے۔



رات کو ماں جو کہانی سناتی، مجھے فلمی سین کی طرح یاد رہتی، ماں کی تمام کہانیوں میں شہزادے شہزادیاں، دیو پریاں تھیں..... کہانی سننے کے دوران میں جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیتا، وہ سمجھتی میں سوچکا ہوں..... حالانکہ میں جاگ رہا ہوتا تھا۔ جب یقین ہو جاتا کہ ماں سوچکی ہے تو میں آنکھیں کھول کر آسمان پر چمکتے چاند ستاروں کو دیکھنے لگتا، میری آنکھیں سب سے زیادہ چاند کو دیکھتیں، مجھے چاند بہت سندر لگتا تھا۔ ہمارے ہمسائے محمد یار کے گھر نیم کا پیڑ تھا، نیم کی ٹہنیوں کے پتوں سے چاند کی روشنی آنکھ بھولی کھیلتی، چاند جب نیم کی ٹہنیوں اور پتوں سے نکلتا تو پہلے سے زیادہ نکھر نکھر اگلتا۔ جس رات آسمان پر بادل ہوتے، اس رات میں دیر سے سوتا۔ چاند اور بادلوں کا ایک دوسرے میں چھپنا چھپانا دیکھتا رہتا۔ جس رات گہرے بادل ہوتے اس رات آسمان خاص اچھا نہ لگتا۔ میں جلدی سو جاتا۔ سردی کے موسم میں کوٹھے کے اندر ہوتا۔ جب تک ماں جاگتی رہتی، لالٹین جلتی رہتی۔ ماں سوتے وقت،

لائین بھادی، کوٹھے میں گھپ اندھیرا ہو جاتا..... اس گھپ اندھیرے میں میری آنکھیں کوٹھے کی چھت دیکھنے کی کوشش کرتیں..... اندھیری رات میں چھت نظر نہ آتی، چاندنی راتوں میں کوٹھے کے دروازے کی درزوں سے چاند کی روشنی اندر آتی دکھائی دیتی۔ چاند راتوں میں دروازے کی یہ درزیں مجھے اچھی لگتی تھیں..... درزوں سے کوٹھے کے اندر آتی چاند کی روشنی کو دیکھتے دیکھتے میں سو جاتا تھا۔

گاؤں میں صبح کا آغاز مرغوں کی اذانوں سے ہوتا، ماں صبح جلدی اٹھا کر قرآن مجید پڑھنے کے لیے مسجد بھیج دیتی، حافظ جی سے قرآن مجید کا سبق پڑھ کر جب گھر آتا تو ماں روٹیاں پکا چکی ہوتی، روٹی کھانے کے بعد بستہ اٹھاتا اور اسکول کو چل دیتا، اسکول سے چھٹی کے بعد سارا دن دوستوں سے کھیلتا، طاہری، لیاقتی نہ ملتے تو میں مینی کے گھر آ جاتا، وہ گھر میں ہی ہوتا، مجھے اپنے گھر میں دیکھ کر بہت خوش ہوتا.....

میں اور وہ ان کی زمینوں کی طرف نکل جاتے، کما د کے موسم میں گئے چوپے، شلغم، مولیٰ، گاجر کے موسم میں ان سے سیر ہوتے۔ ان کی زمینوں پر کیکر، بیر، ٹاہلی اور سوڑے کے پیڑ تھے۔ جس پیڑ پر ماکھو لگا ہوتا، ہم اسے اُتارنے کی ہر ممکن کوشش کرتے..... پیڑ کے اوپر نہ چڑھا جاتا تو نیچے سے وٹے مارتے، میرا نشانہ خوب تھا، ماکھو کی چھلی پر لگتا تھا، اگر چھلی میں شہد ہوتا تو نیچے اس کی دھاریں بہ نکلتیں۔ ہم نیچے ہاتھ کر دیتے، ہاتھوں پر شہد کی جو دھاریں گرتیں۔ وہ چاٹتے ہوئے خوش ہوتے، ساتھ مستیاں بھی کرتے۔ ساون کے مہینے میں سیاہ بادل آسمان کی فضا میں گردش کرتے دکھائی دیتے، ہوا تیز ہوتی تو وہ تیز بھاگتے نظر آتے۔ بارش میں نہاتے ہوئے کبھی کبھار ہم نہر کی پٹری پر بھی آ جاتے، بارش سے نہر میں پانی پہلے سے زیادہ لگتا، بارش میں نہر کا پانی کناروں سے تھوڑا سا اوپر آ جاتا۔ نہر کے پار سرکنڈوں کے بوٹے اور کیکر کے درخت سہم ہوئے نظر آتے۔

شہر مجھے بہت یاد آنے لگا تھا، ایک دن پھر ماں مجھے اپنے ساتھ شہر لے گئی۔ شہر میں ہم ماں بیٹا ایک خوبصورت بنگلے میں داخل ہوئے تھے۔ اس بنگلے کے احاطے میں گھاس اُگی ہوئی تھی..... ترتیب کے ساتھ کافی گیلے رکھے ہوئے تھے، لان میں ایک میز اور کچھ کرسیاں پڑی تھیں۔ ماں کسی کرسی پر نہیں، نیچے گھاس پر بیٹھ گئی۔ میں اس کے ساتھ لگا ہوا تھا، بنگلے کے اندر سے ایک خوبصورت عورت باہر آئی تو ماں اسے دیکھ کر اٹھی، ساتھ مجھے بھی اٹھنا پڑا۔ اس عورت نے خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے تھے، وہ آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی، کرسی پر بیٹھنے کے بعد ماں سے باتیں کرنے لگی، اس کے لہجے میں ترس اور ہمدردی تھی۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ جب واپس آئی، اس کے ایک ہاتھ میں پرانے کپڑے اور دوسرے ہاتھ میں پرانی جوتی کے دو جوڑے تھے۔ اس نے کپڑے اور جوتی کے جوڑے ماں کے آگے رکھ دیے اور کرسی پر بیٹھ کر ماں سے باتیں کرنے لگی۔ اب اس کے چہرے پر ناگواریت کی شکنیں نظر آنے لگی تھیں، اسے ماں کا آنا اچھا نہ لگا تھا..... مجھے سامنے کرسی پر بیٹھی عورت اچھی نہیں لگ رہی تھی، میں چپ تھا۔ پھر اس نے ماں کو چلے جانے کا بولا۔ ماں نے پرانے کپڑے اور جوتیاں اٹھائیں، مجھے ساتھ لے کر بنگلے سے باہر آ گئی۔ مجھے دکھ ہو رہا تھا کہ اس عورت نے ماں کو اس طرح ناگواریت سے چلے جانے کا کیوں کہا؟ وہ عورت تحصیل دار کی بیوی تھی، اس تحصیل دار کی جس کی گاڑی کے ساتھ میرے باپ کا ایکسڈنٹ ہوا تھا۔

اس دن ماں کے ساتھ تحصیل دار کے بنگلے پر جانا مجھے ذرا اچھا نہ لگا۔ واپسی پر میں نے ماں سے کوئی ضد نہ کی کہ مجھے یہ لے کر دو، اس دن میں نے شہر سے کوئی چیز کھائی۔ واپسی پر تمام رستے خاموش رہا، مجھے بنگلے والی عورت پر غصہ آ رہا تھا۔ ماں کچھ نہ کچھ سمجھ گئی تھی، اس لیے خاموش تھی۔ اس دن مجھے ماں کے ساتھ شہر جانا اچھا نہ لگا، گاؤں میں آ کر کچھ دن اُداس رہا۔ کچھ دنوں کے بعد میں بنگلے کی عورت کو بھول گیا، پھر

دوستوں کے ساتھ ہنسنے کھیلنے لگا۔ اس کے بعد ماں کئی ماہ شہر نہ گئی، میں دوسری سے تیسری جماعت میں آ گیا، مجھے تختی اور سلیٹ پر لکھنا اچھا لگنے لگا۔ میں کتابوں کو ذوق شوق سے پڑھنے لگا، ماسٹر شکور جو سبق دیتا، اگلے دن مجھے یاد ہوتا، میں سب لڑکوں سے زیادہ ذہین تھا۔ سال کے بعد امتحان ہوا، امتحان کے بعد جب نتیجہ آیا میں پھر تھرڈ آیا تھا، میں نے تیسری جماعت کے امتحان میں بھی اپنی سابقہ پوزیشن برقرار رکھی تھی۔ تیسری جماعت میں بھی جب تھرڈ آیا تو میں نے دل میں کہا، اب میں کبھی فرسٹ نہ آ سکوں گا۔

چوتھی جماعت میں میں کافی سمجھ بوجھ والا ہو گیا تھا، کچھ ہر سال تھرڈ پوزیشن نے سوچنے سمجھنے کے قابل بنا دیا تھا۔ میں خدا کی کائنات پر کافی غور و فکر کرنے لگا تھا، خدا کے بارے میں کچھ زیادہ ہی سوچنے لگا تھا۔ چاچا فٹو کو آتا دیکھ کر رستہ بدل لیتا تھا، اسے دیکھتے ہی مجھے تھرڈ پوزیشن یاد آ جاتی تھی۔ میں چاچا فٹو کے گھر کے سامنے سے نہ گزرتا کہ کہیں اس پر نظر نہ پڑ جائے۔ گاؤں میں ہم شاید سب سے زیادہ غریب تھے، ماں محنت مزدوری کر کے ہماری کفالت کر رہی تھی، دونوں بڑے بھائی گائے، اس کے پچھڑے اور بکریوں کے چارے کا بندوبست کرنے میں لگے رہتے۔ میں چوتھی جماعت میں تھا جب ماں بیمار ہو گئی، ہماری روزمرہ کی زندگی کا سارا نظام درہم برہم ہو گیا۔ ماں کی بیماری طول پکڑتی گئی، گاؤں میں ہمارا کوئی رشتہ دار نہ تھا۔ ماں نے بڑے بھائی کو سمجھا کر تائی کے گھر بھیج دیا، تائی ہم سے بہت پیار کرتی تھی، تائی کے علاوہ ہم کسی رشتہ دار کو نہ جانتے تھے۔ اگلے دن بھائی کے ساتھ تائی آ گئی، ماں اس سے مل کر رونے لگی، تائی نے کافی دلائے، تسلیاں دیں.....

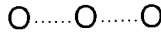
گھر کا نظام ٹھیک ہو گیا، تائی نے تمام گھریلو کام سنبھال لیا، ہمیں وقت پر روٹی ملنے لگی۔ ماں ٹھیک ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ ہمارے ہاں تائی کو آئے چار پانچ دن ہی ہوئے تھے کہ تایا اور اس کے دونوں بیٹے بھی آ گئے، جس دن تایا اور اس کے بیٹے آئے

اس سے اگلے دن ہمارے گھر کے باہر ویگن آگئی، ماں کو ویگن میں ڈال دیا گیا۔ ویگن کا بندوبست تایا نے کیا تھا، گھر کا ضروری سامان ویگن میں لا دیا گیا، ڈھور ڈنگر ہمسائے نور حسن کے سپرد کر دیے گئے۔ میں، ماں، دونوں بڑے بھائی، تایا، تائی اور ان کے بیٹے ویگن میں بیٹھ گئے۔ گھر کو تالہ لگا دیا گیا۔ ویگن میں بیٹھتے وقت میری آنکھیں بھیگ گئیں، سب کچھ آنا فانا ہوا تھا..... دو اڑھائی گھنٹے کے سفر کے بعد ویگن تایا کے گھر کے باہر جا کر رُک گیا..... یہ ہمارے رشتے داروں کا گاؤں تھا۔ تایا کا گھر دو کمروں پر مشتمل تھا، ایک پکا، اور ایک کچا۔ پکا کمرہ مغرب میں جبکہ کچا کمرہ مشرق میں تھا، درمیان میں صحن تھا۔ صحن میں دو کیکر کے درخت تھے، تایا کے گھر پہلی رات پکے کمرے میں گزری۔

اگلے دن ماں کو اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ اسپتال میں، میں اور تائی، ماں کے ساتھ تھے، بڑے دونوں بھائیوں کو ماں نے واپس گاؤں بھیج دیا۔ دو ہفتے ماں اسپتال میں رہی، دو ہفتے کے بعد ماں کی حالت ٹھیک ہو گئی، ہم اسپتال سے واپس گھر آ گئے۔ ماں نے تایا کے بڑے بیٹے کو بھجوا کر دونوں بڑے بھائیوں کو بلوالیا، تایا نے رہنے کے لیے ہمیں کچا کمرہ دے دیا۔ ہم نے اپنا تمام ضروری سامان اس کمرے میں رکھ لیا۔ جب ماں بالکل ٹھیک ہو گئی تو ایک دن اس نے مجھے اپنے ساتھ لیا اور گاؤں کو چل دی، ہم شام کے وقت گاؤں پہنچے۔ 'مینی، لیاقتی، طاہری کو جب میرے آنے کا پتا چلا تو فوراً ہمارے گھر آئے، ان سے ملتے وقت میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آنے والی رات ہم نے مل کر بہت باتیں کیں، آدھی رات تک لُھک چھپ کھیلنے رہے۔ اس سے اگلے دن ماں نے تمام ڈھور ڈنگر نور حسن کو اوانے پونے بیچ دیے۔ اس دن مجھے محسوس ہو گیا کہ اب ہم ہمیشہ کے لیے یہ گاؤں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ گھر سے نکلتے وقت گھر کے در و دیوار کو بھیگی آنکھوں سے دیکھا، راستے میں جتنی عورتیں ملیں، انہوں نے مجھے پیار کیا، میری بلائیں لیں، اس دن میرے چہرے پر اُداسی تھی۔ گاؤں کو چھوڑتے ہوئے مجھے دکھ ہو رہا تھا، نہر

کے ساتھ پٹری پر چلتے ہوئے تمام درخت اُداس لگ رہے تھے، نہر کے چلتے پانی، نہر کے پار کیکر کے درخت اور سرکندوں کے بُوٹے سب کو میں یاسیت سے دیکھ رہا تھا۔ اسکول کے پاس آ کر ماں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، اسکول میں ماسٹر شکور کرسی پر بیٹھا تھا، اس کے سامنے میز کے اوپر حاضری رجسٹر اور ساتھ ڈنڈہ رکھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے ٹائوں پر تمام کلاسوں کے لڑکے بیٹھے پڑھ رہے تھے، مجھے دیکھ کر انہوں نے پڑھنا بند کر دیا۔ دوسرے ٹاٹ پر مینی لیاقتی، طاہری بیٹھے تھے، ان کو دیکھتے ہی میری آنکھیں بھیگ گئیں، پہلے میں ان کے ساتھ بیٹھا ہوتا تھا، اب میں ماسٹر شکور کے سامنے کھڑا تھا۔ مجھے ماں کے ساتھ دیکھ کر مینی لیاقتی، طاہری کے چہرے بجھ گئے، وہ مجھے دُکھ سے دیکھ رہے تھے۔

ماں نے ماسٹر شکور سے سرٹیفکیٹ کی بات کی۔ ماسٹر شکور نے ایک لڑکے کو کمرے کے اندر سے ایک رجسٹر لانے کو کہا، لڑکا کمرے کے اندر سے رجسٹر لے کر آ گیا۔ ماسٹر شکور نے لڑکے سے رجسٹر لیا، اسے کھولا، ایک کاغذ پر لکھتا رہا۔ میں ماں کے ساتھ افسردہ کھڑا تھا، پھر ماسٹر شکور نے اس کاغذ پر مہر لگائی، رجسٹر سے وہ کاغذ پھاڑ کر ماں کو پکڑا دیا۔ جب اس نے سرٹیفکیٹ ماں کو پکڑا یا اس وقت میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ماسٹر شکور نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، وہ کرسی سے کھڑا ہو گیا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہے جا رہے تھے، میں نے روتی آنکھوں سے مینی لیاقتی، طاہری کی طرف دیکھا، وہ بھی مجھے روتا دیکھ کر رونے لگے تھے۔ ماں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، اسکول سے نکلتے وقت آخری بار جب میں نے اپنے دوستوں کی طرف دیکھا، وہ آستینوں سے آنسو پونچھ رہے تھے۔ اس کے بعد ہم اسکول سے باہر آ گئے، مینی لیاقتی، طاہری، اسکول اور گاؤں پیچھے رہ گیا۔ ماں نے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا، ہم شہر کی جانب جانے والی سڑک پر چلتے ہوئے دیگن کے پاس آ گئے، دیگن میں بیٹھے، کچھ وقت کے بعد دیگن چل پڑی، شام کے وقت ہم تایا کے گھر پہنچے۔



تایا کے گھر کچا کمرہ ہمیں مستقل سکونت کے لیے مل گیا، ہمارے کئی رشتے دار کراچی میں کام کر رہے تھے، دونوں بھائی ان کے ساتھ کراچی چلے گئے۔ اس گاؤں میں میرا ذرا دل نہ لگ رہا تھا، رہ رہ کر مجھے اپنے دوست ہی نہیں وہ گاؤں، اس کی گلیاں، کچے گھر، ان گھروں میں رہنے والے سادہ دل لوگ یاد آتے تھے۔ اس گاؤں میں زیادہ رشتے داروں کے گھر تھے۔ ان میں چاچے، ان کے بیٹے، بیٹیاں، سوتیلے بھائی اور بہنیں تھیں۔ اس گاؤں سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر شہر تھا، گاؤں میں کوئی گلی نہ تھی، مغربی طرف سڑک، مشرقی طرف قبرستان تھا، آدھا گاؤں پکے گھروں پر مشتمل تھا۔ تایا کا گھر قبرستان کی طرف تھا، اس گاؤں میں مجھے قبرستان اچھا لگا۔ کچھ دنوں کے بعد تایا کے بیٹے گاؤں سے ہمارا بقیہ سامان بھی اٹھا لائے، اب ہم مکمل طور پر اس گاؤں کو چھوڑ آئے تھے۔ جب بھی گھر سے نکلتا سامنے قبرستان نظر آتا۔ قبرستان میں کھجور، کیکر، نیم اور وان کے درخت تھے۔

شہر کے شروع میں جو پرائمری اسکول تھا، اس میں مجھے داخل کرا دیا گیا۔ نیا اسکول، نئے لڑکے، نئے اُستاد، کچھ دن تو میں سہا، سہا سا رہا، پھر گاؤں کے لڑکے دوست بن گئے۔ ان میں زیادہ رشتہ دار تھے، ان کے ساتھ اسکول جاتا، ان کے ساتھ واپس گھر آتا، ان کے ساتھ کھیلتا۔ ریاض، شاہد، فیصل، بابر میرے دوست اور کلاس فیلو تھے مگر ان کے ساتھ مینی، لیاقی، طاہری کی طرح دوستی نہ تھی۔ میں ان کے ساتھ ہر کھیل کھیلنے لگا، وانجو، پتو، گرم، باندو، کلہا، لُھک، چھپ اور کرکٹ کھیلتا، ہر کھیل میں، میں تیز تھا۔ سب لڑکے میرے دوست بن گئے مگر یہ دوست مینی، لیاقی، طاہری کی جگہ نہ لے سکے۔ میں ان کے ساتھ ان جیسا بننے کی کوشش کرتا مگر ناکام رہتا، چھٹی کے دن ہم قبرستان میں کھیلتے۔ وان کے گرے پیڑ کے اوپر چڑھ کر بل کا ٹکڑا کھیلنے لگتے، قبرستان میں زیادہ کھجور

کے درخت تھے۔ قبرستان کے چاروں اطراف سرکنڈوں کے بوٹے تھے۔ گاؤں کی شمالی طرف شہر تھا، ایک بل کھاتی سڑک شہر کو جاتی تھی۔ شمالی طرف جہاں سے گاؤں شروع ہوتا، وہاں ایک کھالہ تھا، اس کھالے کے اوپر ایک پلایا بنی ہوئی تھی، ہم تمام دوست اس پلایا پر بیٹھ کر ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتے تھے۔

برادری کے علاوہ کچھ غیر برادری کے بھی گھر تھے، ہمارے گھر سے تین گھر چھوڑ کر چوتھا گھر ثمرین کا تھا، ثمرین پانچویں جماعت میں تھی، میں جب بھی ان کے گھر جاتا، وہ مجھے پیار کی نظر سے دیکھتی۔ صبح جب اسکول جانے لگتا تو مجھے ان کے گھر کے آگے سے گزرنا پڑتا، وہ اپنے گھر کے دروازے میں کھڑی ہوتی..... جب تک میں نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتا، وہ پیچھے سے مجھے دیکھتی رہتی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی تھی۔ اسکول سے چھٹی کے بعد جب میں گھر آتا، ان کے گھر کے دروازے کی طرف دیکھتا، وہ مجھے دروازے میں نظر نہ آتی۔ شہر میں اس کے والد کی کریانہ کی دکان تھی۔ اسکول سے چھٹی کے بعد وہ دکان پر چلی جاتی..... وہاں سے اس کا بڑا بھائی زاہد اور وہ اکٹھے گھر آتے۔ اس کا بڑا بھائی زاہد ساتویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ ثمرین گھر میں سب سے چھوٹی تھی، اس کی تمام بڑی بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ میں ان کے گھر روز چلا جاتا، اس کی ماں مجھ سے بے حد پیار کرنے لگی تھی، اس کا بھائی زاہد بھی مجھے اپنے گھر میں دیکھ کر خوش ہوتا۔ اسکول سے چھٹی کے بعد میں گھر آ کر جلدی جلدی روٹی کھاتا، روٹی کھانے کے بعد قبرستان میں چلا جاتا اور وان کے درخت کے نیچے بیٹھ کر ثمرین کا انتظار کرتا۔ جب اس کا بھائی زاہد اسے موٹر سائیکل پر بٹھائے شہر کی طرف سے آنے والی سڑک پر دکھائی دیتا تو میرے دل کو چین آتا۔

ڈیڑھ دو گھنٹے وان کے نیچے بیٹھا رہتا، جب سائے لمبے ہو جاتے تو اٹھتا اور ان کے گھر آ جاتا۔ ثمرین کا بھائی زاہد مجھے دیکھ کر خوش ہوتا، میری آنکھیں ثمرین کو دیکھنے

کے لیے بے تاب ہوتی تھیں۔ میں ان کے گھر زاہد کے ساتھ کھیلتا، ثمرین کبھی جاگ رہی ہوتی، کبھی سوئی ہوتی، جس دن جاگ رہی ہوتی، مجھے اپنے گھر میں دیکھ کر خوش ہوتی۔ وہ مجھے چھپ کر دیکھتی تھی، وہ ہمارے لیے شربت بناتی، اس میں لیموں کا رس ڈالتی۔ میں اور زاہد شربت پیتے، ساتھ کھیلتے بھی رہتے، زیادہ تر ہم چاری اور لوڈو کھیلتے تھے، ان کے گھر کا صحن کافی کھلا تھا، ان کے صحن میں ایک نیم اور دو کیکر کے درخت تھے، ان کا گھر دو کمروں اور ایک بیٹھک پر مشتمل تھا۔ بیٹھک کچی تھی، بیٹھک کے ساتھ ان کے گھر کا بیرونی دروازہ تھا، گھر میں ثمرین کافی لاڈلی تھی، سب سے چھوٹی تھی، شاید اس لیے سب اس سے پیار کرتے تھے.....

مجھے دیکھتے ہی مسکراتی تھی، میں ان کے گھر ثمرین اور اس کی مسکراہٹ دیکھنے آتا تھا۔ ہم دونوں کے بچپن کے دن تھے..... اس عمر میں ہی ثمرین مجھے بے حد اچھی لگنے لگی تھی۔ اسکول جاتے وقت، اسکول سے آتے وقت میرا اسی کی طرف خیال ہوتا..... گرمی کی چھٹیوں میں وہ ہر وقت گھر میں ہوتی، میں بلا ناغہ ان کے گھر جاتا..... ثمرین اپنے گھر میں میرا انتظار کر رہی ہوتی تھی اور مجھے اپنے گھر میں دیکھ کر خوش ہوتی۔ مجھے اس کی مسکراہٹ ان کے گھر کھینچ لاتی، وہ مجھے پیار کی نظر سے دیکھتی تھی، پتی دھوپ میں بھی مجھ سے گھر میں نہیں بیٹھا جاتا تھا۔ میں دوپہر کے وقت ثمرین کے گھر کے آگے سے ضرور گزرتا۔ اس کے گھر دو تین بکریاں تھیں، جب کبھی ثمرین انہیں قبرستان میں چراتی نظر آتی، تب میں اس کے قریب چلا جاتا اور کھجور کے درخت کے نیچے کھڑا ہو کر اسے دیکھتا رہتا۔ ایک دن دوپہر کے وقت وہ مجھے کھالے کے پاس کھڑی نظر آئی، اس کے ہاتھ میں کیکر کی باریک سی چھڑی تھی، اس کی بکریاں کھالے کے ساتھ چر رہی تھیں اور وہ کھالے کے ساتھ کیکر کے نیچے کھڑی تھی۔ میں اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا، وہ مجھے اپنے قریب دیکھ کر خوش ہوئی اور کھالے کے پانی میں چھڑی مارتے ہوئے بولی۔

”گرمی کی چھٹیاں ہوگئی ہیں، میں کچھ دنوں کے لیے اپنی بہن کے پاس جا رہی ہوں، کل چلی جاؤں گی۔“

وہ مجھے مسکرا کر بتا رہی تھی، میں اُداس ہو گیا تھا، پھر وہ اپنی بکریوں کی طرف چلی گئی، میں لیکر کی چھاؤں میں کچھ دیر کھڑا رہا۔ میں نے بھیگی آنکھوں سے ثمرین کی طرف دیکھا، وہ مجھ سے کافی دُور جا چکی تھی، اسے میری بھیگی آنکھیں نظر نہ آ سکتی تھیں۔ گھر آتے وقت میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ اس دن میں ثمرین کی خاطر پہلی بار رویا تھا، حالانکہ وہ چند دنوں کے لیے اپنی بہن کے پاس جا رہی تھی، اس کے باوجود میں رو پڑا تھا..... گھر آ کر میں سو گیا۔ جب اُٹھا تو شام کا وقت تھا، اس دن میں ثمرین کے گھر نہ گیا، شام کے بعد رات آ گئی، وہ پورے چاند کی رات تھی، اس رات میں دیر تک چاند کو دیکھتا رہا۔ اس رات میں نے ثمرین کو بہت یاد کیا۔ جب مجھے یہ خیال آتا کہ کل وہ چلی جائے گی تو میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے، اس رات میں کچھ دیر سے سویا۔

اگلے دن ثمرین اپنے بھائی زاہد کے ساتھ اپنی بہن کے گاؤں چلی گئی، اس کی بہن کا گھر کبھی دُور دراز گاؤں میں تھا، اس کے جانے کے بعد میرے شب و روز میں اُداسی آ گئی۔ سارا دن ثمرین یاد آتی رہتی، رات کو اسے یاد کر کے سوتا۔ دن کو زیادہ وقت قبرستان میں گزرتا..... وان کے درخت کی چھاؤں میں گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ بیس دن اپنی بہن کے ہاں گزار کر ثمرین واپس آ گئی، اس دن میں بہت خوش ہوا تھا، بیس دنوں کے بعد ثمرین کو دیکھا تھا، میں قبرستان میں وان کے نیچے بیٹھا تھا، جب وہ اپنے بھائی زاہد کے ساتھ گھر واپس آئی..... انہیں گھر داخل ہوتے دیکھ کر میں وان کے نیچے سے اُٹھا، تیز قدموں سے چلتا ہوا ثمرین کے گھر آ گیا۔ اس کا بھائی زاہد مجھے دیکھ کر خوش ہوا، میں بیس دنوں کے بعد ان کے گھر آیا تھا۔ ثمرین مجھے دیکھ کر خوش ہوئی، اس نے مجھے مسکرا کر دیکھا، بیس دنوں کا سارا غصہ اُتر گیا۔ اس نے ہمارے لیے شربت بنایا، میں اور زاہد نیم

کے درخت کی چھاؤں میں چارپائی پر بیٹھ کر کھیلنے لگے تھے۔ ثمرین کمرے سے مجھے چوری چوری دیکھ کر مسکرا رہی تھی.....

شام تک میں ان کے گھر رہا..... شام کے وقت جب میں ان کے گھر سے اپنے گھر آیا تو میں کافی خوش تھا۔ ثمرین آگئی تھی اس نے مجھے بار بار مسکرا کر دیکھا تھا میں نے خوش تو ہونا ہی تھا۔ رات مجھے چاند ستارے اچھے لگ رہے تھے ثمرین کی مسکراہٹ مجھے سونے نہ دے رہی تھی..... رات کے بارہ ایک بجے کے قریب مجھے نیند آئی تھی پھر ان کے گھر جانا معمول بن گیا میں اپنے کلاس فیلوز اور گاؤں کے دوستوں سے دُور ہوتا جا رہا تھا ان کے ساتھ تھوڑی دیر کھیلتا پھر ان سے چھپ چھپا کر ثمرین کے گھر آ جاتا جہاں وہ میرا انتظار کر رہی ہوتی۔ میں اور زاہد شام تک کھیلتے رہتے جب صحن میں تھوڑا تھوڑا اندھیرا ہو جاتا تب میں اپنے گھر آتا.....



گاؤں کی جنوبی طرف ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ریلوے لائن تھی مجھے یہ گاڑی کی لائن اچھی لگتی تھی۔ ہفتے میں ایک بار ضرور اس لائن کی طرف آتا اس کے پھٹوں کے اوپر دُور تک پیدل چلتا پھر واپس گاؤں آ جاتا۔ کبھی ریاض ساتھ ہوتا، کبھی فیصل، کبھی میں تنہا ہی چلا جاتا۔ گاؤں کی شمالی طرف آٹھ دس ایکڑ دُور نہر تھی نہر کی طرف ہفتے میں میرے ایک دو چکر لگ جاتے مجھے مچھلیاں پکڑنے کا شوق تھا اس شوق کو پورا کرنے کے لیے مجھے ضرور نہر کی طرف جانا پڑتا۔ دن کا زیادہ وقت قبرستان میں گزرتا، چھٹی کے دن زیادہ وقت ثمرین کے گھر گزارنے کی کوشش کرتا..... میں چوتھی جماعت میں تھرو پوزیشن سے بچ گیا۔ ہم کل آٹھ لڑکے تھے فرسٹ، سیکنڈ، تھرڈ اور لڑکے آئے میں صرف پاس ہوا تھا میں خوش تھا اگر تھرڈ آتا تو مجھے دکھ ہوتا۔ ثمرین پانچویں سے چھٹی جماعت میں ہوگئی، وہ لڑکیوں کے ہائی اسکول پڑھنے جانے لگی۔ شہر کے ہائی اسکول میں جانے

سے اس کے نازخروں میں اضافہ ہوا تھا۔ جب میں ان کے گھر جاتا مجھے دیکھ کر پہلے کی طرح مسکراتی، میرے ذہن پر ہر وقت اس کی مسکراہٹ سوار رہتی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے تھے بات کرنے کا موقع بھی مل جاتا، پھر بھی کوئی بات نہ کرتے تھے۔ ثمرین کافی ذہین تھی..... اس کی نسبت میں پڑھائی میں کچھ کمزور تھا۔

ہم دونوں کو محسوس ہو چکا تھا کہ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے ہیں، اپنے آپ ہی محبت کے جذبے میں بڑھوتری آتی گئی۔ ثمرین مسکرانے کے علاوہ اب مجھے دیکھ کر ہاتھ بھی ہلانے لگی تھی، مسکراہٹ کے بعد اس کا یوں ہاتھ ہلانا اچھا لگتا تھا، جواب میں، میں بھی مسکراتا۔ میں جب ان کے گھر کے آگے سے گزرتا، میری آنکھیں اسے دیکھنے کو بے قرار ہوتیں، وہ مجھے اپنے گھر کے دروازے کے ساتھ لگی نظر آ جاتی تو میرے دل کو چین آ جاتا۔ بچوں میں کوئی گلی نہ تھی، مجھے کہیں بھی جانا ہوتا، ان کے گھر کے آگے سے گزرنا پڑتا۔ میرے دونوں بھائی ایسے کراچی گئے کہ وہاں کے ہی ہو کر رہ گئے۔ سال ڈیڑھ سال کے بعد آتے اور ایک دو دن رہ کر واپس چلے جاتے۔ دونوں نے وہاں شادیاں کر لی تھیں، کچھ عرصے کے بعد انہوں نے اپنی ماں اور چھوٹے بھائی کو یکسر فراموش کر دیا، رشتے داروں کے بار بار اصرار کیے جانے پر ماں نے اپنے چھوٹے دیور قدیر سے نکاح کر لیا، قدیر پہلے میرا چاچا تھا، اب سوتیلا باپ بن گیا..... اس کی پہلی بیوی فوت ہو چکی تھی اور اس کی کوئی اولاد نہ تھی..... برادری کے پُر زور اصرار پر ماں نے قدیر سے نکاح کیا..... نکاح کے بعد ہم قدیر کے گھر آ گئے.....

سوتیلے باپ قدیر کا گھر دو پکے کمروں پر مشتمل تھا، کافی کھلا صحن تھا، صحن میں نیم کا درخت تھا..... پہلے پہل تو قدیر کا رویہ میرے ساتھ اچھا رہا، پھر اس نے اپنا سوتیلا پن دکھانا شروع کر دیا۔ مجھ پر بلاوجہ سختی کرنے لگا، چھوٹی چھوٹی باتوں پر ڈانٹنے اور مارنے لگا..... میرے دل میں سوتیلے باپ کے لیے نفرت پیدا ہو گئی اور یہ نفرت دن

بدن بڑھتی گئی۔ صبح جلدی اسکول چلا جاتا، اسکول سے چھٹی کے بعد گھر آتا، روٹی کھانے کے بعد پھر گھر سے نکل جاتا، پھر رات کے وقت گھر آتا..... دو سال کا عرصہ اور بیت گیا، ثمرین نویں اور میں آٹھویں جماعت میں ہو گیا۔ ثمرین کے بھائی زاہد نے میٹرک کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا..... کریانہ کی دکان میں اپنے والد کا ہاتھ بٹانے لگا..... صبح کے وقت اپنے والد کے ساتھ دکان پر چلا جاتا، ثمرین کو اسکول سے چھٹی کے ٹائم پر گھر چھوڑنے کے بعد پھر دکان پر چلا جاتا، ثمرین اب کچھ محتاط ہو گئی تھی..... میں جب ان کے گھر جاتا، مجھے دیکھ کر مسکراتی، موقع ملتا تو ہاتھ بھی ہلا دیتی۔ جس دن اس کے گھر کوئی نہ ہوتا، چند لمحے مجھ سے پیار محبت کی باتیں کرتی، وہ بھی اس دن جس دن اس کی ماں شہر دکان پر چلی جاتی۔ ثمرین گھر میں اکیلی رہ جاتی، میں کسی نہ کسی طرح ان کے گھر چلا جاتا، ثمرین مجھے دیکھتی تو بھاگ کر بیرونی دروازے کے پاس آ جاتی اور دروازہ بند کر کے میرے ساتھ لگ کر کھڑی ہو جاتی۔ جب وہ میرے ساتھ لگتی تو بے حد شرماتی..... اس سے بہت کم باتیں ہوتیں، مجھے اپنی چھوٹی اور گہری آنکھوں سے دیکھتی رہتی، میں اس سے پیار محبت کی باتیں کرتا تو وہ جواب میں ہوں، ہاں کرتی رہتی۔ چند منٹوں کے بعد وہ دروازہ کھولتی اور مجھے چلے جانے کا کہتی..... اس کے کہنے کے باوجود میں اس کے ساتھ لگ کر کھڑا رہتا..... ان کے گھر جتنی دیر کھڑے رہتے، بہت کم باتیں کرتے، زیادہ تر ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے۔ میں مسکراتا تو وہ بھی مسکرا دیتی، اس کے سامنے کے دو دانت کچھ بڑے تھے..... جب وہ ہنستی تو بے حد خوبصورت لگتی۔ میں مہبوت ہو کر اس کی مسکراہٹ دیکھتا تھا۔ مجھے اس کی مسکراہٹ اچھی لگتی تھی، ابھی تک میں نے صرف اس کے ہاتھوں کو چھوا تھا، میرے ہاتھوں نے اس کے ہاتھوں کو کئی بار پکڑا، میں اس کے قریب جانے کے جتن کرتا تھا، جس دن اسے دیکھ نہ پاتا، رات کو دیر سے نیند آتی، جب تک وہ مجھے نظر نہ آتی، میں ان کے گھر کے آگے سے گزرتا رہتا.....

دوسرے لڑکوں کی نسبت مجھ میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت زیادہ تھی..... کم عمری میں بُرائی اچھائی کو سمجھنے لگا تھا۔ میری ذات سے کوئی فرق کرتا، مجھے محسوس ہو جاتا، سوتیلے باپ کے تھارتی رویے کے باوجود میں نے کبھی اسے بددعا نہ دی، نہ اس کے متعلق کبھی برا سوچا۔ وہ جب گھر میں ہوتا تو میں گھر سے باہر چلا جاتا، ماں کے ہوتے ہوئے میں سوتیلے باپ کے گھر سہا سہا رہتا تھا۔ میری ذہنی نشوونما پر اچھے اثرات نہ پڑ رہے تھے، میری تربیت کرنے والا کوئی نہ تھا..... ماں کا پیار بھی تقسیم ہو گیا تھا، میں خود کو سب سے کمتر سمجھنے لگا تھا۔ کھیل میں بھی میرا یہی حال تھا، سب سے اچھا کھیلتا تھا، پر اپنی اہمیت نہ جتلاتا..... اسکول میں تمام کلاس فیلوز سے ڈرا ڈرا سا رہتا اور سب سے پچھلے بیٹوں پر بیٹھتا..... کسی سے بات نہ کرتا۔ زیادہ خاموش رہتا۔ میرے ذہن پر ہر وقت شمرین سوار رہتی، زیادہ لڑکے اُستادوں سے ٹیوشن پڑھتے تھے، ٹیوشن کی بدولت اُستادوں کی نظر میں ان کی کافی قدر ہوتی، میں کسی اُستاد سے ٹیوشن نہ پڑھ سکا..... ماں بڑی مشکل سے میرے تعلیمی اخراجات پورے کر رہی تھی، مجھے کئی کئی دن خرچہ نہ ملتا۔ باقی کلاس فیلوز اسکول سے باہر ریڑھیوں سے کافی کچھ کھاتے پیتے، میں تفریحی اوقات میں اسکول کے گراؤنڈ میں کسی درخت کے نیچے بیٹھ جاتا، جب کوئی کلاس فیلو کچھ کھلانے پر رضامندی ظاہر کرتا، میں انکار کر دیتا۔

آٹھویں جماعت میں میری ریاضی کافی کمزور تھی، شمرین اپنے بھائی زاہد سے گھر میں پڑھ لیتی تھی..... میں نے زاہد کو کبھی نہ بتایا کہ میری ریاضی کمزور ہے۔ اس نے ایک دن خود ہی کہہ دیا کہ رات کو میرے پاس پڑھنے آ جایا کرو، جس دن اس نے مجھے پڑھنے کا کہا، اس سے اگلے دن شام کے وقت میں ریاضی کی کتاب اور ایک رف کاپی لے کر شمرین کے گھر آ گیا۔ ابھی تک زاہد نہ آیا تھا، شمرین چولہے پر اپنی ماں اور باپ کے پاس بیٹھی تھی..... تھوڑا تھوڑا اندھیرا ہو چکا تھا، ان کے صحن میں بلب جل رہا تھا۔ مجھ

پر کافی گھبراہٹ طاری تھی، ثمرین کی ماں اور ابا مجھے اس طرح سہا ہوا دیکھ کر ہنسنے لگے تھے۔ ثمرین چور نظروں سے مجھے دیکھ کر مسکرائی تو مجھ میں کچھ حوصلہ پیدا ہوا۔ ثمرین کی ماں بولی..... پتر! تیرا اپنا گھر ہے، شرمایا کیوں رہا ہے..... ہمارے پاس نہیں بیٹھنا چاہتے تو بیٹھک میں چلے جاؤ۔ اس نے ثمرین سے 'ہا' جاؤ بیٹھک کا بلب جلا دو۔ میں ہونٹوں کی طرح ان کے گھر کے صحن میں کھڑا تھا۔ ثمرین بیٹھک کا بلب جلا کر واپس آئی تو میں بیٹھک میں آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھک میں تین کرسیاں ایک میز اور ایک چار پائی پڑی تھی، میز کے اوپر جو کپڑا ڈالا ہوا تھا، اس پر کڑھائی کی ہوئی تھی، سرخ رنگ کے دھاگے سے گلاب کے پھول بنائے ہوئے تھے۔ یہ کڑھائی ثمرین کی ہوگی، اس خیال کا آنا تھا کہ میرے ہاتھ گلاب کے پھولوں کے اوپر ٹھہر گئے، مجھے کڑھائی والا کپڑا اچھا لگ رہا تھا، دل کر رہا تھا اسے چڑا کر لے جاؤں اور رات کو سوتے وقت چہرے کے اوپر کر کے سوؤں۔ ثمرین کے گھر کی کچی بیٹھک میں بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا، ایسے لگ رہا تھا جیسے ثمرین پہلے سے زیادہ میرے قریب ہو گئی ہو۔ میں نے کچی بیٹھک کا تمام جائزہ لیا، چھت ایک گارڈز، لکڑی کے بالوں اور سرکنڈوں کے کانوں کی تھی، اس کی دیواریں چکنی مٹی کے گارے سے لپٹی ہوئی تھیں۔ میں بیٹھک کا جائزہ لے رہا تھا کہ زاہد آ گیا، اسے دیکھ کر میں کرسی سے اٹھنے لگا تو اس نے مسکراتے ہوئے مجھے بیٹھنے کا کہا، وہ میری سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ مجھے ریاضی کے سوال سمجھانے لگا..... اس دوران اس کی ماں دو کپوں میں چائے لے آئی..... اس کی ماں میز پر چائے کے کپ رکھ کر واپس چلی گئی، شاید اس نے اس لیے کوئی بات نہ کی کہ زاہد مجھے سوال سمجھا رہا تھا۔ میں اور زاہد دونوں نے چائے پی، چائے پینے کے بعد کتاب بند کر دی..... لوڈو کھیلنے کا موڈ بنا، پر لوڈو اس کمرے میں تھا، جس میں زاہد کی ماں، ابا اور ثمرین تھے، میں زاہد سے ریاضی کے سوال سمجھنے آیا تھا، اگر ہم لوڈو کھیلتے تو اس کی ماں اور ابا کو معیوب لگنا

تھا، لوڈو کا پروگرام اگلی رات پر رکھ دیا گیا۔

اب میں روز شام کے بعد ان کی بیٹھک میں آ جاتا۔ میں بیٹھک کے اندر آ کر دروازہ بند کر دیتا، بیٹھک کا دروازہ بند کر کے پیچھے مڑ کر دیکھتا تو وہ سامنے کھڑی ہوتی، وہ اندر صحن میں جانے سے پہلے پیار محبت کی کوئی نہ کوئی بات کر کے جاتی..... میں اس کے جانے کے بعد کرسی پر بیٹھ کر اپنے ہاتھ میز پر پڑے کڑھائی والے کپڑے کے اوپر رکھ دیتا اور شمرین کو سوچنے لگتا۔ شمرین دن بہ دن میرے قریب ہوتی جا رہی تھی، میں نشے کی طرح اس کا عادی ہو چکا تھا۔ اسے جب تک نہ دیکھتا حالت مضطرب رہتی۔ جب دیکھ لیتا تو سکون آ جاتا۔ کچھ دنوں کے بعد شمرین کی مسکراہٹ میں کمی آ گئی، وہ بیٹھک کا دروازہ کھولنے کے بعد مجھ سے کوئی بات کیے بغیر واپس چلی جاتی۔ جب بیٹھک میں زاہد آ جاتا، مجھے سوال سمجھاتا، میرا ذہن شمرین کی طرف ہوتا، زاہد نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ میں سوال سمجھنے کے دوران ذہنی طور پر حاضر نہیں ہوتا۔ اس نے مجھ سے کافی بار پوچھا کہ کیا بات ہے؟ جواب میں میں ہنس دیتا، کوئی اور بات شروع کر دیتا.....

پھر ایک دن اسکول سے واپس آ کر روٹی کھانے کے بعد کاپی کا ایک کاغذ پھاڑا، تین چار رنگوں کی پنسلیں جیب میں ڈالیں، قبرستان میں آ کر وان کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا، اس ورق پر پنسلوں سے دل بنایا، اس دل میں خوبصورتی سے لکھا ”شمرین! میں تم سے پیار کرتا ہوں“ اتنا لکھنے کے بعد دل کو رنگوں سے بھرا، جب دل رنگوں سے بھر گیا تو میں نے آنکھوں کے ہر زاویے سے اُسے دیکھا، دل میں لکھا ہوا شمرین! میں تم سے پیار کرتا ہوں..... مجھے بہت پیارا لگا، میں نے اس کاغذ کو پلیٹ کر جیب میں ڈال لیا..... شام کے وقت میں کچھ جلدی بیٹھک کے دروازے پر آ گیا..... اس شام پہلی بار میری حالت بے تاب تھی، میرا دل دھڑک رہا تھا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ بیٹھک کے دروازے پر دستک دی، دستک دینے کے بعد جیب میں تہہ کیا کاغذ نکال کر ہاتھ میں

کر لیا، دروازہ ثمرین نے ہی کھولا تھا، وہ مجھے دیکھ کر تھوڑی سی مسکرائی..... ہاتھ کی مٹھی میں چھپایا کاغذ اس کے ہاتھ میں تھا دیا، ثمرین کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ کاغذ کو مٹھی میں چھپا کر اندر چلی گئی، مجھے خوشی ہوئی کہ ثمرین نے میرے دل کے اظہار کو نظر انداز نہیں کیا۔ میرے انگ انگ میں خوشی ہوید ا تھی، دل کر رہا تھا کہ واپس چلا جاؤں زائد سے کوئی سوال نہ سمجھوں، پر ثمرین کی ماں اور ابا کو میرے آنے کا پتا چل چکا تھا..... میں کرسی پر بیٹھ گیا، میز پر وہی کپڑا بچھا تھا، اس کے اوپر کڑھے گلاب کے سرخ پھول مجھے بے حد پیارے لگ رہے تھے۔ میں نے ان کے اوپر اپنے ہاتھ رکھ دیئے، جب میں ان پھولوں پر ہاتھ رکھتا تو مجھے ایسے محسوس ہوتا، جیسے میں نے ثمرین کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ دیئے ہوں۔

اس رات زائد کچھ دیر سے آیا، میں اس سے تھوڑا سا پڑھنے کے بعد واپس اپنے گھر آ گیا، میں خوش خوش گھر آیا تھا، جیسے بہت بڑا معرکہ سر کر لیا ہو۔ اس رات دیر تک مجھے نیند نہ آئی، میری آنکھوں کے سامنے وہ رنگوں سے بھر ا دل تھا، جس میں ”ثمرین! میں تم سے پیار کرتا ہوں“ صاف نظر آ رہا تھا۔ خیال میں مجھے ثمرین نظر آ رہی تھی، اس کے ہاتھوں میں میرا دل پکڑا ہوا تھا، وہ اسے مسکرا کر دیکھ رہی تھی، میں اسے یاد کرتا کرتا سویا۔ اگلے دن اسکول سے واپسی پر میں ثمرین کی جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب تھا، شام تک ان کے گھر کے آگے سے کئی بار گزرا مگر ثمرین دروازے پر دکھائی نہ دی..... شام تک میری حالت پہلے سے بھی زیادہ بے قرار ہو گئی، شام کے بعد میں نے اپنے گھر سے کتاب اور کاپی اٹھائی اور ان کی بیٹھک کے دروازے پر آ گیا، دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھٹکھٹایا، بیٹھک کا بلب جلا، دروازہ ثمرین نے ہی کھولا..... دروازہ کھولنے کے بعد وہ ایک پل نہ رُکی، نہ اس نے میری طرف دیکھا.....

میں بیٹھک کے اندر آ گیا، ثمرین کی اس بے رخی نے مجھے مزید مضطرب کر دیا،

میں نے بے دلی سے کتاب اور کاپی چار پائی پر پھینکی، حالانکہ پہلے میز پر رکھتا تھا۔ کرسی پر بیٹھا تو آنکھیں میز کے اوپر بجھے گلاب کے پھول والے کپڑے پر ٹھہر گئیں، کڑھائی کے کپڑے کے اوپر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا پڑا تھا، میری آنکھیں دل کے ٹکڑوں کو دُکھ سے دیکھ رہی تھیں۔ پھر میرے دائیں ہاتھ نے دل کے ٹکڑے اٹھالئے، مٹھی میں بند کر لیے..... میں کچھ دیر بیٹھک کی دیواروں کو دُکھ سے دیکھتا رہا پھر اٹھا..... چار پائی سے کتاب اور کاپی اٹھائی اور واپس اپنے گھر آ گیا..... گھر آ کر چار پائی پر لیٹ گیا..... سردی کا موسم شروع ہو چکا تھا، پچھلی رات کو ٹھنڈ پڑنے لگی تھی، لوگ کمروں میں سونے لگے تھے، میں ابھی باہر سوتا تھا..... گھر آتے ہی میں باہر صحن میں پڑی چار پائی پر لیٹ گیا، میری آنکھوں کی سیدھ میں آسمان پر چاند چمک رہا تھا، میرے دائیں ہاتھ کی مٹھی میں میرا ٹکڑے ٹکڑے دل تھا، چاند آنسوؤں میں دھندلا گیا، میں نے دل کے تمام ٹکڑے جیب میں ڈال لیے، میری آنکھوں سے آنسو بہتے رہے، چاند مغرب کی طرف جھکتا گیا، رات گزرتی رہی۔ ثمرین نے میرا دل ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا، مجھے اس کا بہت دُکھ تھا، میری آنکھوں میں چاند بار بار دھندلا رہا تھا..... جب مجھے سردی لگنے لگی تو اوپر رضائی کر لی..... جب چاند میری آنکھوں سے اوجھل ہوا تب مجھے نیند آئی تھی۔

اگلے دن میری حالت ٹھیک تھی، کوئی میرے چہرے کو دیکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ رات کو میں روتا رہا ہوں، اس دن میں اسکول بھی نہ گیا، روٹی کھانے کے بعد گھر سے نکلا، قبرستان میں واں کے نیچے آ کر بیٹھ گیا۔ میری جیب میں میرے دل کے ٹکڑے تھے، ان کے علاوہ ایک تہہ کیا ہوا کاغذ تھا، جو میں کاپی سے پھاڑ لایا تھا، اس کاغذ پر میں کچھ لکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ دوپہر تک سوچتا رہا، دوپہر کے بعد میں نے جیب سے کاغذ اور پین نکالا اور لکھنے لگا۔ کاغذ کے ایک طرف ثمرین کو خط لکھا، اس خط میں اپنے آنسوؤں کا بھی ذکر کیا، بہت افسردہ لفظوں سے خط لکھا، دُکھ کی حالت میں لکھے خط کو جب میں نے

تیسری بار پڑھا تو غصے سے پھاڑ دیا۔ میں ثمرین سے ہمدردی نہیں چاہتا تھا، اس دن قبرستان میں مجھ سے ایک جگہ ٹک کر نہ بیٹھا گیا، شام تک قبرستان میں چلتا پھرتا رہا، جب سورج ڈوب گیا تب گھر آیا۔ اس شام زاہد سے پڑھنے ان کے گھر نہ گیا۔ کئی دن میں ان کے گھر نہ گیا، ایک شام زاہد خود ہمارے گھر آ گیا، ماں نے اسے دُعا میں دیں، اس نے زیادہ باتیں نہ کیں، نہ وہ ہمارے گھر بیٹھا، اس نے مجھے کتاب اور کاپی لانے کو کہا، میں کمرے سے کتاب اور کاپی اٹھا لایا، وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آیا، ہم دونوں بیٹھک میں کرسیوں پر بیٹھ گئے، کچھ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے مجھے ریاضی کے سوال سمجھائے، پھر ہم دیر تک لوڈو کھیلتے رہے۔ میں نے چہرے سے ظاہر نہ ہونے دیا کہ مجھے کوئی دُکھ ہے۔ جب میں گھر آنے لگا تو زاہد نے مجھے اگلے دن آنے کی تاکید کی، جب ان کی بیٹھک سے نکلا، حالت غمزہ تھی، سر جھکائے گھر آیا۔

اگلے دن اسکول میں بھی اُداس تھا، مجھ سے صحیح طرح سے پڑھا نہ گیا، میرا دھیان ثمرین کی طرف تھا کہ اس نے کیوں میرا دل ٹکڑے ٹکڑے کیا؟ اتنی سنگ دل؟ اتنی بے رحم؟ اسکول سے چھٹی کے بعد گھر آیا، روٹی کھانے کے بعد قبرستان میں آ گیا، واں کے نیچے بیٹھ کر گھنٹوں سوچتا رہا۔ ثمرین کے گھر کی طرف دیکھتا رہا، پھر میری سوچ کا زاویہ بدل گیا، میں سوچنے لگا کہ آج زاہد سے پڑھنے جاؤں کہ نہ جاؤں؟ بیٹھک کا دروازہ ثمرین کھولے گی، اس کے وہ ہاتھ کھولیں گے، جنہوں نے میرا دل ٹکڑے ٹکڑے کیا، میں اس کے غصیلے چہرے کو کیسے دیکھوں گا؟ شاید اس کو مجھ سے نفرت ہو چکی ہو؟ شاید اس نے اپنی ماں ابا کو بتا دیا ہو؟ اگر اس نے زاہد کو بتا دیا تو؟ آج میں زاہد کے پاس پڑھنے نہیں جاؤں گا، پر اس سے وعدہ کیا ہے..... آج جا کر دیکھوں گا کہ سب کا رویہ کیسا ہے؟ اگر ان کو میرا آنا ناگوار لگا تو پھر کبھی ان کے گھر نہ جاؤں گا، اگر ثمرین نے نفرت سے دیکھا تو آج کے بعد ثمرین کی طرف دیکھنا گناہ سمجھوں گا۔ قبرستان سے شام کے وقت

گھر آیا، گھر آ کر روٹی کھائی، جب کچھ اندھیرا ہو گیا، میں نے کتاب اور کاپی اٹھائی اور چلتا ہوا ان کی بیٹھک کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازہ کھٹکھٹانے کو دل نہیں کر رہا تھا، تذبذب میں تھا، آخر حوصلہ کر کے دروازے پر دستک دی، کچھ لمحوں کے بعد کوئی تیز قدموں سے دروازے کی طرف آیا، بیٹھک کا بلب جلا، دروازے کی کنڈی کھلی، دروازہ کھولنے والی شمرین تھی۔ دروازہ کھولنے کے بعد پیچھے نہ مڑی، میں بیٹھک کے اندر آ گیا، میں نے دروازہ بند کر دیا، پیچھے مڑ کر دیکھا، وہ کھڑی تھی، میں اس کے چہرے کی طرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا، میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے چہرے پر میرے لیے نفرت ہو اور میں اسے دیکھوں۔ میری آنکھیں نیچے جھکی ہوئی تھیں.....

شمرین چپ تھی، میں بھی چپ تھا، وہ ذرا بھی نہیں ڈر رہی تھی کہ اندر سے اس کی ماں یا ابا بیٹھک میں آ سکتے ہیں، میں نے ڈرتے ہوئے نظریں اٹھا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر چکی تھیں، اس کے چہرے پر میرے لیے نفرت نہ تھی، اس کے دائیں ہاتھ کی مٹھی میں ایک تہہ کیا ہوا کاغذ تھا، اس نے کاغذ میرے ہاتھ میں تھمایا، تمھارے وقت اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے، وہ آنسو پونچھتی ہوئی واپس مڑی، تیز قدموں کے ساتھ اندر صحن میں چلی گئی، میں ہٹکا بٹکا کھڑا تھا۔ میری سانسیں تیز ہو چکی تھیں، دھڑکنوں میں شدت آ چکی تھی۔ میرے دائیں ہاتھ کی مٹھی میں تہہ کیا ہوا کاغذ تھا، جو وہ تھما گئی تھی، میں کرسی پر بیٹھ گیا، ابھی زاہد نہ آیا تھا، میں نے مٹھی کھولی اور دھڑکتے دل کے ساتھ کاغذ کھولا۔ اس نے کاپی کے ورق پر چند لائنیں لکھی تھیں، جنہیں پڑھنے کے بعد خوشی سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے جو میرا دل ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا، اس کی بار بار معافی مانگی، اس نے بار بار لکھا مجھے تم سے محبت ہے، جب میں نے تمہارے دل کے ٹکڑے کیے تب سے مجھے سکون نہیں ملا، میں نجانے کتنی بار تمہیں یاد کر کے رو چکی ہوں..... نیچے اس نے اپنا اور میرا نام اکٹھا لکھا تھا، یہ شمرین کا

پہلا خط تھا.....

میں نے خط کو تہہ کر کے جیب میں ڈال لیا، اپنے ہاتھوں سے آنکھوں کے آنسو پونچھے اور آنسوؤں سے بھیگی انگلیاں میز کے اوپر ڈالے پھولوں والے کپڑے پر رکھ دیں۔ میں کافی خوش تھا، جب زاہد بیٹھک میں آیا تو میں نے اس سے ہنس ہنس کر باتیں کیں، زاہد کرسی پر بیٹھ کر مجھے حیرانگی سے دیکھنے لگا، اس نے کئی سوال کیے، میں اپنی خوشی اس پر کیسے عیاں کرتا؟ اپنے آپ سے اس کی توجہ ہٹانے کے لیے میں نے ریاضی کی کتاب کھول کر اس کے آگے رکھ دی، زاہد نے مجھے کچھ سوال سمجھائے، پھر ہم کافی دیر تک لوڈ و کھیلے رہے..... جب میں ان کی بیٹھک سے باہر آیا، کافی خوش تھا، جیسے مجھے دو جہاں کی خوشیاں مل گئی ہوں۔ گھر آ کر مجھے دیر تک نیند نہ آئی، میں کمرے میں دیر تک چارپائی پر لیٹا رہا، چادر اوڑھے چھت کو دیکھتا رہا..... ثمرین کو سوچتا رہا..... اسے سوچتا سوچتا سو گیا۔

○.....○.....○

وقت گزرتا رہا، ہفتے مہینوں میں بدلتے رہے مہینوں نے سال کا روپ دھارا، میں آٹھویں سے نویں، ثمرین نویں سے دسویں جماعت میں گئی، پھر ایک سال کے بعد میٹرک پاس کرنے کی خوشی میں ثمرین کے گھر والوں نے تمام گاؤں میں مٹھائی بانٹی..... مجھے اس کے پاس ہونے کی بہت خوشی ہوئی تھی۔ میں جب چاہتا ان کے گھر چلا جاتا، ان کے گھر جانے پر کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ شام کے بعد ان کے گھر چلا جاتا، بیٹھک کھلو کر بیٹھ جاتا۔ زاہد کچھ دیر سے آتا، دن کے وقت میں پھپھ پھپھا کر ان کے گھر جاتا، دوپہر کے بعد ثمرین کی باں شہر چلی جاتی، ثمرین گھر میں اکیلی رہ جاتی، جونہی مجھے موقع ملتا، میں ان کے گھر چلا جاتا۔ ثمرین مجھے اپنے گھر کے بیرونی دروازے پر دیکھتی تو تیز قدموں سے چلتی ہوئی میرے قریب آ جاتی، بیرونی دروازے کی اندر سے

کنڈی لگا دیتی، دروازے کے ساتھ لگ کر ہم کھڑے ہو جاتے، ثمرین میرے ساتھ لگ جاتی، ہم کئی منٹ دروازے کے ساتھ کھڑے پیار، محبت کی باتیں کرتے رہتے..... ثمرین کافی ڈرتی تھی، اسے ڈرتے دیکھ کر مجھے بھی ڈر لگنے لگا تھا، دروازے کے ساتھ دس پندرہ منٹ کی ملاقات کھڑے کھڑے ہوتی، پھر وہ ڈرتی ہوئی دروازے کی کنڈی کھول دیتی، پہلے باہر جھانکتی، مکمل تسلی کر لینے کے بعد مجھے چلے جانے کو کہتی، میں تیز قدموں سے ان کے گھر سے نکلتا اور اپنے گھر آ جاتا۔

ثمرین نے شہر کے کالج میں داخلہ لے لیا تھا، اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا، زاہد روز اسے موٹر سائیکل پر بٹھا کر کالج چھوڑنے جاتا اور چھٹی کے وقت واپس گھر چھوڑ کر جاتا..... چوتھی جماعت سے لے کر دسویں جماعت تک مجھے کوئی دوست نہ ملا جس سے میں اپنے دل کی باتیں کرتا، تمام کلاس فیلوز سے دُعا سلام تھی، دوستی کسی سے نہ تھی۔ کلاس میں نثار مجھے سب سے امیر لگتا تھا، کسی گاؤں سے آتا تھا، کلاس میں یہ واحد لڑکا تھا جس کی اپنی موٹر سائیکل تھی، شاید اس لیے میں اسے امیر سمجھتا تھا۔ نثار تمام ٹیچرز کا چہیتا تھا، وہ انچارج ٹیچر سے ٹیوشن بھی پڑھتا تھا، نثار اگلے بیٹوں پر بیٹھتا، انچارج ٹیچر ان لڑکوں کو مارتا جو اس سے ٹیوشن نہ پڑھتے، ان میں، میں بھی شامل تھا..... نثار کو کبھی مار پڑتے نہ دیکھی..... جب مجھے مار پڑتی تو مجھے نثار بالکل اچھا نہ لگتا..... میں کلاس میں بہت کم گو تھا، میری کسی کلاس فیلو کے ساتھ دوستی نہ تھی، میرے ذہن پر ہر وقت ثمرین سوار رہتی۔ تمام کلاس فیلوز تیز طرار تھے، میں ذہین ضرور تھا، پر ان کی طرح تیز طرار نہ تھا، کوئی کلاس فیلو میرا مذاق اڑاتا تو میں برداشت کرتا اور اسے کوئی جواب نہ دیتا۔ کلاس فیلو ہونے کی بناء پر نثار کے ساتھ دعا سلام تھی، اس کے علاوہ مجھے کوئی علم نہ تھا کہ وہ کہاں سے آتا ہے، کتنے بڑے زمیندار کا بیٹا ہے؟ کسی کلاس فیلو کی زندگی پر میں نے کبھی نہ سوچا، جو امیر ماں باپ کے بیٹے تھے، کافی تیز طرار تھے، مجھے یہ لڑکے خاص اچھے نہ لگتے تھے، میں ان سے

دُور دُور رہتا تھا..... نثار اتنا ذہین نہ تھا اس کے باوجود انچارج ٹیچر کے ڈنڈوں سے بچ جاتا تھا..... مجھے انچارج ٹیچر کا یہ فرق اچھا نہ لگتا تھا..... پھر میٹرک کے پیپرز ہوئے، پیپرز کے دنوں میں میں کچھ بیمار ہو گیا، اس کے باوجود میرے پیپرز ایتھے ہوئے۔ پیپرز کے دوران بیمار ہونے کے باوجود میں خوش تھا، تمام کلاس فیلوز برابری میں پیپرز دے رہے تھے، انچارج ٹیچر کے ڈنڈوں سے نجات مل چکی تھی۔

جب پیپرز ختم ہوئے تو میں کافی خوش تھا، چھٹیاں ہی چھٹیاں تھیں، سارا دن گاؤں میں گھومتا پھرتا۔ دوپہر کے بعد شرمین کا انتظار کرتا۔ جب اس کا بھائی زاہد اسے گھر چھوڑ جاتا تو میں ان کے گھر کے آگے چکر لگانے شروع کر دیتا۔ اس وقت تک جب تک کہ وہ مجھے دروازے پر مسکراتی ہوئی دکھائی نہ دیتی..... اب میں شرمین کو خط لکھنے لگا تھا، میں چھپتا چھپاتا ان کے گھر جاتا۔ اسے خط دیتا، وہ مجھے خط دیتی۔ میٹرک کے پیپرز کے بعد میں اسے زیادہ خط لکھنے لگا تھا۔ ہمارے دلوں میں محبت کا جذبہ توانا ہوتا گیا، پیپرز کے بعد رزلٹ تک چھٹیاں تھیں..... بڑا بھائی کبیر کراچی سے گھر آیا..... دو دن رہنے کے بعد جب وہ واپس جانے لگا تو میں نے ساتھ جانے کا عندیہ دیا، اس نے بخوشی مجھے ساتھ لے جانے کی ہامی بھری..... جانے سے پہلے میں نے شرمین کو خط لکھ دیا کہ میں کچھ دنوں کے لیے بھائی کے ساتھ کراچی جا رہا ہوں، جلدی واپس آ جاؤں گا..... جانے والے دن جب میں بھائی کے ساتھ ان کے گھر کے آگے سے گزرا، وہ مجھے دروازے پر کھڑی نظر آئی، اس دن اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ تھی، ہاتھ ہلاتے وقت وہ رو پڑی تھی، پھر آنسو پونچھتی ہوئی اندر چلی گئی..... اور میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

میں بھائی کے ساتھ کراچی پہنچ گیا، کراچی کے متعلق بہت باتیں سنی تھیں، اس لیے میرے دل میں کراچی دیکھنے کا شوق پیدا ہوا تھا، پہلی بار ریل گاڑی میں اتنا لمبا سفر کیا..... اسٹیشن سے باہر آ کر کراچی کی بڑی بڑی بلڈنگوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ہر طرف

لوگ ہی لوگ شور شرابہ اور ٹریفک کا اژدھام تھا، جہاں بھائی رہتے تھے تنگ سا گھر تھا، دونوں ایک گھر میں ہی رہ رہے تھے..... اپنی بیگمات و بچوں سمیت..... بڑے بھائی کے تین چھوٹے بھائی کے دو بچے تھے..... دونوں بھابھیاں مجھے اخلاق سے ملیں..... انہوں نے مجھ سے اُردو میں باتیں کیں..... ان کے بچے رورہے تھے، وہ مجھ سے باتیں کر رہی تھیں..... گھر دو کمروں اور ایک چھوٹی سی بیٹھک پر مشتمل تھا۔ بھابیوں کی باتوں میں جب ایک چھوٹا سا وقفہ آیا تو میں سونے کا بہانہ کر کے ان کے پاس سے اٹھ کر بیٹھک میں آ گیا، بیٹھک میں پڑی واحد چارپائی پر آ کر لیٹ گیا۔ چارپائی پر لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی، میں مغرب کی اذان کے وقت جاگا، اٹھنے کے بعد صحن میں آیا، دونوں بھائی کام سے آ چکے تھے..... وہ پہلے ہی دن کام پر چلے گئے تھے، انہوں نے کوئی آرام نہ کیا تھا..... دونوں مجھے دیکھ کر مسکرائے، میں ہاتھ روم میں داخل ہو گیا..... نہانے کے بعد میں بھابیوں کے پاس آ کر بیٹھ گیا..... بھابیوں نے ہمارے آگے کھانا رکھ دیا..... ہم سب نے مل کر کھانا کھایا، کھانا کھانے کے بعد میں اٹھ کر دوبارہ بیٹھک میں آ گیا..... مجھے بھابیوں کے تنگ گھر میں کافی گھٹن محسوس ہونے لگی تھی..... اب جب میں چارپائی پر لیٹا تو میرے حواس پر ثمرین سوار تھی۔



پندرہ دن بڑی مشکل سے کراچی میں گزارے، ان پندرہ دنوں میں مزارِ قائد اور ساحلِ سمندر ہی دیکھ سکا، سمندر کو دیکھ کر تحیر میں مبتلا ہو گیا۔ سامنے حدِ نگاہ تک پانی ہی پانی اور آتی جاتی لہریں تھیں۔ کراچی میں سب سے زیادہ سمندر کا نظارہ خوبصورت لگا۔ ان پندرہ دنوں میں حالتِ مضطرب اور بے قرار رہی..... ثمرین شدت سے یاد آتی رہی، ان پندرہ دنوں میں مجھے محسوس ہوا کہ میں ثمرین سے کتنی محبت کرتا ہوں..... جب بھائی کام پر چلے جاتے تو میں بیٹھک کے دونوں دروازے بند کر کے چارپائی پر لیٹ جاتا،

تنبہائی کے ان لمحات میں ثمرین بہت یاد آتی۔ جب وہ شدت سے یاد آتی، میں بے قرار ہو کر خود سے باتیں کرنے لگتا، پندرہ دنوں کے بعد میں نے بھائیوں کو واپس جانے کا کہہ دیا۔ بھائی چاہتے تھے میں کچھ دن اور ان کے پاس رہوں لیکن مجھے رہ رہ کر ثمرین یاد آ رہی تھی، وہ میرے حواس پر اس طرح سوار تھی کہ اس کے بعد مجھ سے ایک دن بھی کراچی میں نہ رہا گیا۔ مجبوراً بھائی مجھے گاڑی میں بٹھا گئے، انہوں نے مجھے ہر طرح سمجھا دیا کہ پہلے کون سے اسٹیشن پر اترنا ہے، وہاں سے کس بس میں بیٹھ کر اپنے شہر جانا ہے۔ مجھے ہر طرح کی سمجھ بوجھ تھی، کراچی جاتے وقت میں نے رستے کو یاد رکھ لیا تھا، اس کے باوجود بھائیوں نے مجھے بار بار سمجھایا۔

جب گاڑی چلی تو میں نے شکھ کا سانس لیا، بھائی ہاتھ ہلاتے اسٹیشن کے جھوم میں گم ہو گئے۔ گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی، تمام رستے مجھے ثمرین یاد آتی رہی، شام کے وقت میں گھر پہنچا، ماں سے ملنے کے بعد میں ثمرین کے گھر کی طرف آ گیا، اسے میرے آنے کی اطلاع مل چکی تھی، جب میں ان کے گھر کے سامنے آیا، وہ مجھے دروازے پر کھڑی نظر آئی، مجھے دیکھ کر بے حد خوش ہوئی، اس کے ہونٹوں پر خوشی کی مسکراہٹ تھی..... اس نے پہلے کی طرح ہاتھ ہلایا، میری پندرہ دن کی بے قرار حالت کو قرار آ گیا، اس شام میں بہت خوش تھا۔ مجھے ثمرین نظر آ گئی تھی، رات کو میں دیر تک جاگنا چاہتا تھا۔ پر سفر کی تھکان نے مجھے جلدی سلا دیا، اگلے دن میں خوش خوش اٹھا، ثمرین کالج جا چکی تھی، ابھی اس کی کالج کی چھٹیاں نہیں ہوئی تھیں۔ اس دن میں گاؤں کے تمام دوستوں سے ملا، دوستوں سے ملنے کے بعد میں گھر آ گیا، گھر میں مجھ سے زیادہ دیر نہ بیٹھا گیا، گھر سے نکل کر قبرستان میں وان کے نیچے بیٹھ کر ثمرین کا انتظار کرنے لگا۔ میں اس دن ثمرین سے ملنا چاہتا تھا، کافی دن اس سے دور رہا، اس سے ملنے کی طلب میں ہلکان تھا، آخر ثمرین اپنے بھائی کے ساتھ آئی نظر آئی، اسے دیکھ کر میرے دل کو چین آ گیا۔ تھوڑی

دیر کے بعد اس کا بھائی واپس شہر چلا گیا، اب میں اس کی ماں کے جانے کا منتظر تھا،
 ثمرین کی ماں ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد گھر سے نکلی، جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تب
 میں دان کے نیچے سے اٹھا اور تیز تیز قدموں کے ساتھ ان کے گھر کی طرف آیا۔ گھر
 کے قریب آ کر دائیں بائیں دیکھا، مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا تھا، پھٹپھٹا چھپاتا ان کے گھر کے
 دروازے تک آ گیا۔ باہر والا دروازے پہلے کی طرح کھلا تھا، میں دروازہ کھول کر جلدی
 سے اندر آ گیا، اندر آتے ہی دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی، ثمرین نے مجھے دیکھا تو تیز
 قدموں سے چلتی ہوئی میرے پاس آ گئی، آتے ہی میری واہوئی بانہوں کے حصار میں
 آ گئی۔ ہم سے کوئی بات نہ ہو رہی تھی، ایک دوسرے کو پیار کی انہماک نظروں سے دیکھ
 رہے تھے، پیارِ محبت کی کچھ باتوں کے بعد اس نے دروازے کی کنڈی کھولی، باہر جھانکا،
 جب اسے تسلی ہو گئی کہ اس پاس کوئی نہیں تو اس نے مجھے جانے کا کہا، میں تیز تیز
 قدموں کے ساتھ اپنے گھر کی طرف آ گیا۔

میرا دل کرتا، میں روزِ ثمرین سے ملوں جس طرح ہم ایک دوسرے کی بانہوں میں
 چھپے، اس سے بے قراری کچھ اور بڑھ گئی، ہم روزِ نہیں مل سکتے تھے..... جس دن ثمرین کی
 ماں شہر چلی جاتی، اس دن میں ان کے گھر چلا جاتا، ہماری چند منٹ کی ملاقات ہو جاتی،
 ہمارے گھر سے ایک گھر چھوڑ کر اس کی بڑی باجی کا گھر تھا، مجھے زیادہ اس کا خطرہ رہتا
 کہ ہماری چند منٹ کی ملاقات کا اسے پتا نہ چل جائے، میٹرک کا رزلٹ آ گیا، میں اچھے
 نمبروں سے پاس ہوا، میرے ثمرین سے زیادہ نمبر آئے تھے، ثمرین میرے پاس ہونے
 پر بہت خوش تھی، پاس ہونے کی خوشی میں گاؤں کے تمام گھروں میں مٹھائی بھجوائی۔
 ثمرین کے گھر خود مٹھائی لے کر گیا۔ شام کا وقت تھا، باہر والا دروازہ اس کی ماں نے
 کھولا، مجھے دیکھ کر کافی خوش ہوئی، میرے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا، اس نے میرے سر پر
 ہاتھ پھیرا، مجھے اندر آنے کا کہا، میں مسکراتا ہوا ان کے گھر میں آ گیا۔ ثمرین مجھے دیکھ کر

مسکراتی ہوئی کمرے کے اندر چلی گئی۔ میں صحن میں پڑی چارپائی پر بیٹھ گیا، گھر میں صرف ثمرین کی ماں تھی جو میرے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گئی، میں نے مٹھائی کا ڈبہ اسے دیا، اپنے پاس ہونے کا بتایا، اونچی آواز سے بتایا کہ کمرے میں بیٹھی ثمرین بھی سُن لے، ساتھ اپنے نمبرز بھی بتائے۔ ثمرین کی ماں سے باتیں کرتے ہوئے چور نظروں سے کمرے کے اندر چارپائی پر بیٹھی ثمرین کو بھی دیکھ لیتا..... جب میں اسے دیکھتا تو وہ مسکرا دیتی، میں ان کے گھر کچھ وقت بیٹھا رہا، پھر ثمرین کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہوا اٹھا اور ان کے گھر سے باہر آ گیا۔ اپنے گھر آتے وقت رستے میں بے حد خوش تھا، ثمرین کو میرے پاس ہونے کی بہت خوشی ہوئی تھی، میٹرک کے بعد آگے کالج میں پڑھنے کی خواہش تھی مگر حالات نے ساتھ نہ دیا..... اس لیے ریگولر پڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا.....

میٹرک کے بعد میں نے نوکری کی کچھ کوششیں کیں پر نوکری نہ ملی، میں نے پرائیویٹ پڑھنے کا پکا ارادہ کر لیا، دو تین ماہ میں ایف۔ اے کی تمام کتابیں اکٹھی کر لیں، دل لگا کر انہیں پڑھنا شروع کر دیا، ثمرین کے گھر ہماری مختصر ملاقاتیں ہو رہی تھیں، ابھی تک مجھ پر کسی کوشک نہ ہوا تھا، میں کافی محتاط تھا، اس وقت ان کے گھر جاتا جب یقین ہوتا کہ اب ان کے گھر کوئی نہیں آئے گا۔ مجھے اس کی بڑی بہن کا ڈر رہتا تھا، باقی گاؤں کے دوستوں کو کچھ کچھ پتا چل چکا تھا کہ میں ثمرین سے محبت کرنے لگا ہوں۔ دوستوں کے علاوہ میرے رشتے داروں، ثمرین کے رشتے داروں کے ذہنوں میں کچھ کچھ شکوک تھے۔ وہ اس لیے کہ میں ثمرین کے گھر اکثر چلا جاتا تھا، ثمرین کے گھر والوں میں سے کوئی مجھے روکتا تو کہتا نہ تھا بلکہ سب لوگ میری کافی عزت کرتے تھے۔ ان کے متعلق میرے ذہن میں کوئی غلط خیال نہ تھا، ثمرین اگر مجھے تھوڑا سا نظر انداز کر دیتی تو مجھے پیچھے ہٹ جانا تھا، اس نے مجھے کبھی نظر انداز نہ کیا۔

ہماری محبت میں اب برابری کا جذبہ آ گیا تھا میں ایف۔ اے کی کتابیں کم پڑھتا،

ثمرین کو زیادہ سوچتا تھا..... ذہن میں ہر وقت اس کا خیال ہوتا، اس کی یاد سائے کی طرح یاد رہتی، ہم ایک دوسرے کو باقاعدگی سے خط لکھنے لگے تھے، ہفتے میں ایک دو خط ضرور لکھتے، ان دنوں مجھ میں لکھنے کا شوق پیدا ہوا، میں ٹوٹی، پھوٹی شاعری کرنے لگا، مجھے غزل لکھنے کے قواعد کا علم نہ تھا، نہ مجھے ردیف، قافیے کی سمجھ بوجھ تھی، ایک ڈائری خرید کر اس پر غزلیں اور دوسری مفکرانہ طرز کی باتیں لکھنے لگا۔ کافی سوچ بچار کرنے لگا تھا، کبھی قبرستان میں بیٹھ کر لکھتا، کبھی کھیتوں میں نکل جاتا اور کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر ڈائری پر لکھتا رہتا۔ لکھنے کے علاوہ مجھ میں کتابیں پڑھنے کا بھی شوق پیدا ہوا، میں شاعری کی کتابیں اور محبت کے موضوع پر لکھے ناول شوق سے پڑھنے لگا۔ پھر میں کچھ رسائل کا مطالعہ کرنے لگا، ان رسائل کو پڑھنے کے بعد مجھ میں لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ میں نے ان رسائل میں لکھنا شروع کر دیا۔ ثمرین خوش تھی کہ میں رسالوں میں لکھنے لگا ہوں..... ان رسالوں میں میرے تین چار قلمی دوست بنے، ان میں شجاعت، حسنین اور منصور سے مستقل خط و کتابت شروع ہوئی۔ کچھ عرصے میں یہ میرے اچھے دوست بن گئے، انہوں نے مجھے اپنی تصویریں بھیجیں، جواب میں میں نے ان کو اپنی تصویریں بھیجیں، ثمرین خوش تھی کہ میرے اتنے اچھے دوست بن رہے ہیں، میں نے رسائل میں باقاعدگی سے لکھنا شروع کر دیا تھا، مجھے لکھنے کی شہد نہ تھی، نہ مجھے اُردو ادب کا پتا تھا، جو سوچتا..... لکھ دیتا، میری تحریروں میں محبت، میری شاعری میں پیار کی چاشنی تھی.....

ثمرین سے ان کے گھر میں دن کے وقت اب بھی مختصر ملاقات ہو رہی تھی..... ہماری محبت دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی، ہم نے محبت کو اپنا نصب العین بنا لیا تھا، ہم محبت کے اس انوکھے بندھن کو محسوس کر کے بے قرار ہونے لگے تھے۔ جس دن ہم ایک دوسرے کو نہ دیکھ پاتے، آنے والی رات دیر سے نیند آتی، بے چینی سے بُرا حال ہو جاتا..... بستر شکنوں سے بھر جاتا۔ ہماری محبت میں برابری کا جذبہ مضبوط ہوتا گیا.....

ثمرین کے رشتے داروں اور گاؤں کے دوسرے لوگوں کو ہمارے میل ملاپ پر شک ہونے لگا تھا۔ میں چھپ کر ان کے گھر جاتا، پر لوگ بھی آنکھیں رکھتے تھے میں کب تک ان کی آنکھوں میں دھول جھونک سکتا تھا؟

جمعے کا دن تھا، ثمرین کی والدہ شہر جا چکی تھیں، اس کی والدہ کے جانے کے بعد بھی میں کچھ وقت قبرستان میں وان کے درخت کے نیچے بیٹھا رہا..... جب مجھے تسلی ہو گئی کہ مجھے دیکھنے والا کوئی نہیں، میں وان کے نیچے سے اُٹھ کر چھپتا چھپاتا اس کے گھر کے دروازے کے سامنے آ گیا۔ جلدی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا، ثمرین نے مجھے دیکھا تو تیز قدموں کے ساتھ چلتی ہوئی میرے قریب آ گئی، آتے ہی مجھ سے لپٹ گئی، ہم ایک ہفتے کے بعد مل رہے تھے، پہلے مجھے موقع نہ مل سکا، اس کے وجود میں لرزش تھی، مجھ سے کوئی بات نہ کر رہی تھی، میرے ہاتھ رخسار پیشانی پُوم رہی تھی، پھر میں نے اس کے ہاتھ رخسار اور پیشانی کو چوما، میرے ہونٹ اس کے رخسار کے اوپر تھے کہ باہر کھٹکا ہوا، ہم دونوں دروازے کے ساتھ کھڑے تھے، ثمرین دروازے کی کنڈی کھول چکی تھی، میں باہر جانے والا تھا، اس کے رخسار کا آخری بوسہ لے رہا تھا کہ باہر سے کسی نے دروازہ زور سے کھول دیا، دروازہ کھلا، میں ثمرین سے دُور ہو گیا، اب بھاگنا بیکار تھا، دروازہ کھل چکا تھا، دروازہ کھولنے والی اس کی بڑی باجی تھی، اس نے مجھے دروازے کے ساتھ ثمرین کے پاس دیکھا تو نفرت سے گالیاں دینے لگی، مجھے بہت غصہ آیا پر میں خاموش رہا، اس کے پاس سے گزر کر باہر آ گیا، اس کی باجی نے غصے سے دروازہ بند کیا، وہ گھر کے اندر صحن میں ثمرین کو برا بھلا کہہ رہی تھی، میں چلتا ہوا سڑک پر آ گیا، اس دن میرے قدموں میں تیزی نہ تھی، میرا سر جھکا ہوا تھا۔ ہم دونوں ملاقات کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے، مجھے لگ رہا تھا کہ اب ثمرین کے گھر پہلے کی طرح ملاقات نہ ہو سکے گی، گھر آ کر چار پائی پر لیٹ گیا، کمرے کے اندر کافی گرمی محسوس ہو رہی تھی، میں نے پنکھا

تک نہ چلایا، شام تک آنکھیں بند کیے لیٹا رہا، ماں سمجھتی رہی کہ مجھے بخار ہے، اس لیے یوں گرمی میں لیٹا ہوا ہوں۔

شام کے وقت میں گھر سے نکلا، ثمرین کے گھر کے آگے سے گزرا، ان کا باہر والا دروازہ بند تھا، کچھ آگے جانے کے بعد جب واپس آیا، کچھ کچھ اندھیرا ہو چکا تھا، ثمرین دروازے پر نظر نہ آئی، میں گھر آ گیا، ماں نے روٹی کا کہا، میں نے بخار کا بہانہ کر دیا۔ چارپائی پر لیٹ کر آسمان کے ستاروں کو دیکھنے لگا۔ اس رات ستارے کافی اُداس لگ رہے تھے، آدھی رات تک اختر شماری کرتا رہا، آدھی رات کے بعد مجھے نیند آ گئی۔ اگلے دن میں کچھ دیر سے اٹھا، ثمرین کی جھلک دیکھنے کے لیے اپنے گھر سے نکلا، ثمرین کے گھر کے سامنے آیا، دروازے پر ثمرین نہیں، اس کی ماں کھڑی تھی، جو میرا انتظار کر رہی تھی، وہ تیز قدموں سے میری طرف آئی، اس نے مجھے رکنے کا کہا، میں رُک گیا، ثمرین کی ماں کے چہرے پر میرے لیے غصہ ہی نہیں نفرت بھی تھی، اس نے مجھے اپنے ساتھ آنے کا کہا۔ میں اس کے ساتھ ان کے گھر میں آ گیا، گھر کے صحن میں کوئی نہ تھا، ثمرین کی ماں مجھے اس بیٹھک میں لے آئی، جس میں مجھے زاہد پڑھاتا تھا، بیٹھک کے اندر ثمرین دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی، ساتھ پڑی چارپائی پر اس کی باجی بیٹھی تھی، اس نے مجھے دیکھا تو چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی، اس کے چہرے پر میرے لیے نفرت تھی۔ ثمرین کی آنکھیں تھوڑی تھوڑی سو جی ہوئی تھیں۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کی ماں نے اسے ضرور مارا ہے۔ اب ہم چاروں بیٹھک میں کھڑے تھے۔ ثمرین کو بیٹھک میں دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ مجھے کس لیے بلایا گیا ہے، ثمرین کی ماں اور باجی نے ثمرین سے پوچھا۔

تیرا اس سے کیا تعلق ہے؟ ثمرین نے جواب میں میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ اس سے پوچھ لو۔ ثمرین کی ماں نے غصے سے مجھ سے پوچھا۔ بتا تیرا اس سے کیا رشتہ

ہے؟ میں نے ثمرین کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔ میرا ثمرین سے محبت کا رشتہ ہے، میں ثمرین سے محبت کرتا ہوں۔ ثمرین کی ماں نفرت سے مجھے گالیاں دینے لگی، ثمرین کی باجی نے بھی گالیاں دیں، میں چپ کر کے سنا رہا، ثمرین کو دیکھ رہا تھا کہ اس کے چہرے پر کیسے تاثرات ہیں، ثمرین کا چہرہ میرے اس خواب سے مطمئن تھا، اس کے ہونٹوں پر تھوڑی سی مسکان نظر آئی، جس نے مجھ میں مزید حوصلہ پیدا کر دیا، ثمرین کی ماں اور اس کی باجی کو میں نے ایک ہی جواب دیا کہ میں ثمرین سے محبت کرتا ہوں، میں اس سے شادی کروں گا، ثمرین کی ماں نے غصے سے مجھے باہر جانے کا اشارہ کیا، بیٹھک سے نکل کر ان کے گھر سے باہر آ گیا، پیچھے ثمرین کی ماں بھی آ گئی، وہ میرے ساتھ چلنے لگی، اس نے غصے سے کہا، میرے ساتھ چلتے رہو، میں اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ہم شہر کی طرف جانے والی سڑک پر آ گئے، ثمرین کی ماں مجھے سمجھا رہی تھی، غصے سے دھمکا رہی تھی، ساتھ چلتے ہوئے یہ بھی کہہ رہی تھی کہ جو ہوا اسے بھول جاؤ اور آئندہ ایسی کوئی حرکت نہ کرنا، میں نے جواب میں پھر کہا، مجھے ثمرین سے محبت ہے، میں اس سے شادی کروں گا، ثمرین کی ماں نے جواب میں پھر مجھے گالیاں دیں، میں نے اس کی گالیوں پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس کے ساتھ ساتھ ضرور چل رہا تھا، پر میرا ذہن ثمرین کی طرف تھا۔

اس کی ماں چلتے چلتے رُک گئی، میں بھی رُک گیا، اس نے پھر مجھے سمجھانا چاہا، پر میری زبان سے وہی الفاظ ادا ہو رہے تھے، رکنے کے بعد چلتے ہوئے ثمرین کی ماں نے مجھے کافی دھمکایا کہ اس کا ابا اور زاہد تمہیں مار دیں گے، میں اس کی دھمکیوں سے ذرا بھی خوف زدہ نہ ہوا، وہ نفرت سے مجھے گالیاں دیتی ہوئی اپنے گھر چلی گئی، میں سوچتا ہوا اپنے گھر آ گیا۔ اس دن کے بعد میں ثمرین کے گھر کے آگے سے تین چار بار گزرا مگر ثمرین دروازے پر دکھائی نہ دی۔

ثمرین کے باہر نکلنے پر پابندی لگ چکی تھی، اس کی ماں اس پر ہر وقت نظر رکھنے لگی، آخر کب تک نظر رکھ سکتی تھی؟ اسے شہر بھی تو جانا تھا۔ چار پانچ دنوں کے بعد وہ پھر شہر جانے لگی، پر اب میں ثمرین کے گھر نہیں جاسکتا تھا، جب وہ شہر جاتی تو ثمرین کے گھر اس کی باجی آ جاتی، ثمرین پر کافی سختی ہو چکی تھی۔ انہوں نے بات کو چھپانا چاہا، پر بات زبان سے نکل گئی۔ ثمرین کی باجی سے کسی کے سامنے بات ہو گئی، میری اور ثمرین کی محبت کا تذکرہ ہر گھر ہونے لگا، سارے گاؤں والوں کو پتا چل گیا، ثمرین کے گھر والے مجھ سے نفرت کرنے لگے۔ میرے اپنے رشتے دار میرے خلاف ہو گئے، گھر میں ماں نے مجھے بہت سمجھایا پر میں بضد رہا۔ میری ایک ہی رٹ تھی کہ میں ثمرین سے محبت کرتا ہوں، اس سے شادی کروں گا۔ سو تیلے باپ نے میرے خلاف کافی باتیں کیں، میں نے اس کی باتوں پر توجہ نہ دی، ثمرین چھپ چھپ کر کہیں نہ کہیں سے مجھے دیکھ لیتی تھی، مجھے دیکھ کر وہ پہلے کی طرح مسکراتی، پہلے کی طرح ہاتھ ہلاتی، میں نے رشتہ داروں اور گاؤں والوں کی باتوں کی پرواہ کرنی چھوڑ دی تھی۔ گھر میں ثمرین پر کافی سختی کر دی گئی، باہر نکلنے پر پابندی لگ گئی۔

سختی اور پابندی کے باوجود ہمارا ایک دوسرے سے خطوط کا تبادلہ ہو رہا تھا، ہفتے میں اسے ایک خط دینے میں ضرور کامیاب ہو جاتا تھا، ثمرین اپنی باجی کے گھر چکر لگاتی، یہ چکر میرے لیے ہوتا تھا، ہفتے میں اسے ایک خط دینے میں سرخرو ہو جاتا، اس خط کے جواب میں ثمرین مجھے خط لکھتی، وہ کالج کے اوقات کار میں کچھ وقت نکال کر خط لیٹر بکس میں ڈال دیتی، میں نے اسے اپنے ایک رازدار دوست کا ایڈریس دیا ہوا تھا، مجھے اس کا خط بحفاظت مل جاتا، حالانکہ اسی شہر کے لیٹر بکس میں ثمرین خط ڈالتی، میرے دوستوں کے خطوں کے ساتھ ثمرین کا خط بھی آ جاتا۔ ملاقات کا سلسلہ تو ختم ہو چکا تھا..... ہماری محبت کا سارے گاؤں والوں کو پتا چل چکا تھا۔ ثمرین میری بدولت بدنام ہو چکی تھی، اس

کے گھر والوں نے میری طرف دیکھنے پر بھی پابندی لگا دی، جب بھی ہمارا آنا سامنا ہوتا یا ایک دوسرے پر نظر پڑتی، وہ مجھے پہلے کی طرح ہی دیکھتی، میرا سوتیلا باپ قدیر میرے خلاف ہو گیا۔ وہ تو موقع کی تلاش میں تھا، اب اسے موقع مل چکا تھا۔ جب میں گھر آتا، ماں کے سامنے میری بے عزتی کرتا اور مجھے ڈراتا دھمکاتا۔ میں اس کی دھمکیوں سے ذرا بھی مرعوب نہ ہوتا، میں نے خود سے عہد کر لیا تھا کہ سوتیلا باپ قدیر کیا ساری دنیا دشمن ہو جائے، میں ثمرین کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔

میں خاموش خاموش رہنے لگا تھا، ثمرین کے خط مجھے باقاعدگی سے مل رہے تھے، ہفتے میں اس کا ایک خط ضرور مل جاتا۔ میں اس کے خط کا جواب لکھ کر اسے دینے میں کامیاب ہو جاتا، ثمرین کے ایف۔ اے کے پیپرز ہو چکے تھے، اب وہ سارا دن گھر میں رہتی تھی۔ اپنی دوست ارم سے ملنے کا بہانہ کر کے ایک چکر شہر کا ضرور لگاتی، جب وہ اپنی دوست ارم سے ملنے جاتی تو خط لکھ کر ساتھ لے جاتی اور راستے میں لیٹر بکس میں خط ڈال کر پھر ارم کے گھر جاتی..... میں اور ثمرین کافی بدنام ہو چکے تھے۔ ہماری محبت کے چرچے عام ہو چکے تھے۔ گاؤں کے لوگ کافی باتیں کرنے لگے تھے، ہم لوگوں کی تمسخرانہ اور بے ہودہ باتوں پر کان نہ دھرتے، ہم صرف ایک دوسرے کو سوچتے، ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کی سوچ اور خیال کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں جدھر جاتا ثمرین میرے حواس پر سوار ہوتی، ثمرین جدھر جاتی سائے کی طرح میرا خیال اس کے ساتھ ہوتا۔ ہر طرح کی پابندیوں، نفرتوں، دھمکیوں کے باوجود ہماری محبت کے آئینے میں کوئی دراڑ نہ پڑی تھی، نہ ہماری محبت میں کوئی کمی آئی تھی۔ دنیا کے رسم و رواجوں سے ایک طرح کی ہم نے بغاوت کر دی تھی، ایک دوسرے کے سوا ہمیں کچھ یاد نہ تھا۔ خونی رشتے ثانوی ہو چکے تھے۔

ہمارے متعلق لوگوں کی باتیں بڑھتی گئیں، ثمرین کے گھر والے اس پر نظر رکھنے

لگے اس کے باوجود وہ مجھے باقاعدگی سے خط لکھ رہی تھی..... میں کالج کے اوقات کار میں کسی نہ کسی طرح سے اس تک خط پہنچا دیتا تھا، جواب میں ثمرین کے خط مجھے ڈاک کے ذریعے سے ملتے تھے..... پھر نجانے کس طرح سوتیلے باپ قدیر کو ہمارے خطوں پر شک ہوا..... وہ ٹوہ میں رہنے لگا، پھر ثمرین کا لکھا ایک خط اس کے ہاتھ چڑھ گیا..... اس نے کسی نہ کسی طرح سے ڈاک خانے سے وہ خط حاصل کر لیا۔ جس دن اس نے خط حاصل کیا، اس دن کی شام کو وہ خط لے کر ثمرین کے گھر پہنچ گیا..... اس کے گھر والوں کو خط دے کر واپس آ گیا، گھر آتے ہی مجھ پر برس پڑا اور ماں کے سامنے میری خوب بے عزتی کی، مجھے خوب سنائیں۔ میں چپ کر کے سنتا رہا، جب وہ مجھے گالیاں دینے لگا تو میں ماں کے پاس سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔ چارپائی پر لیٹ کر چھت کو دیکھنے لگا، رات بیتی رہی..... میں چھت کو دیکھتا رہا، رہ رہ کر مجھے ثمرین کا خیال آ رہا تھا کہ اس پر کیا گزری ہوگی، اسے گھر میں ضرور مار پڑی ہوگی..... ثمرین کو سوچتے سوچتے رات کے پچھلے پہر جا کے کہیں مجھے نیند آئی۔

اگلے دن باوجود بار بار چکر لگانے کے ثمرین مجھے نظر نہ آئی، اس کے گھر والوں نے اسے گھر میں پابند سلاسل کر دیا تھا، میرا سوتیلے باپ قدیر اپنی کارکردگی پر خوش تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا اور میں زیادہ تر گھر سے باہر رہنے لگا۔ ثمرین پر ہر طرح کی پابندیاں لگ گئیں..... پہلے بدنام تھے سو تھے اس خط نے وہی سہی کسر بھی نکال دی تھی، دو ہفتے ثمرین کا خط نہ آیا، میری صحت دن بہ دن گرتی گئی، میں قبرستان میں دان کے پیڑ کے نیچے گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ گھر میں ثمرین کے ساتھ اروا سلوک ہو رہا تھا، اس کے گھر والے سنجیدگی سے اس کی شادی پر سوچ بچار کر رہے تھے۔ جب میں ان کے گھر کے آگے سے گزرتا، سب مجھے نفرت سے دیکھتے، میں خاموشی سے سر جھکائے کبھی ادھر کبھی ادھر چلتا۔ ثمرین گھر میں نظر بند ہو چکی تھی، میں اسے دیکھنے کے جتن کر رہا تھا،

بڑی مشکل سے ہفتے میں ایک بار دکھائی دیتی، اس کے چہرے پر غم اور اداسی آچکی تھی مجھے دیکھ کر پہلے کی طرح مسکراتی، نہ ہاتھ ہلاتی، اس کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں میں مریچکی تھی۔

پھر نجانے کس طرح اس نے مجھے ایک خط لکھا، مجھے وہ خط ڈاک کے ذریعے سے ہی ملا..... دوستوں کے خطوں کے ساتھ مجھے اس کا خط ملا، جس راز دار دوست کے ایڈریس پر خط آتے تھے میں نے اسے بالکل نہ بتایا کہ ثمرین کا ایک خط پکڑا جا چکا ہے میں اس سے خط لے کر شہر کے قریب سے گزرتی نہر پر آ گیا، ایک کیکر کے درخت کے نیچے بیٹھ کر اس کا خط پڑھا، خط میں ثمرین نے کافی کچھ لکھا، گھر والوں کے طعنے، زہر میں بجھے کلمات، اس کی جلدی شادی کرنے کی ایک ایک گھریلو بات لکھی، خط ثمرین کے آنسوؤں سے کئی جگہ سے بھیگا ہوا تھا..... جہاں سے خط بھیگا وہاں اس نے دوبارہ قلم چلایا تھا، آخر میں اس نے اپنی دوست ارم کے گھر ملاقات کا دن، تاریخ اور وقت لکھا تھا، اس خط کو پڑھ کر میں نے یہاں سے چلے جانے کا عہد کر لیا۔ ثمرین میری بدولت کافی دکھ اور کرب میں تھی، خط پڑھنے کے بعد میں نے سوچ لیا کہ ثمرین سے ملاقات کے بعد میں یہاں سے چلا جاؤں گا..... اگر میں یہاں مزید رہتا تو ثمرین پر مزید عتاب نازل ہوتے رہتے تھے۔ اس نے خط میں بار بار لکھا کہ گھر والے میری شادی جلدی کرنے کا سوچ رہے ہیں، میں نے یہاں سے جانے کا ہی نہیں کچھ بننے کا بھی عہد کر لیا.....



وہ جمعرات کا ابراہم لودون تھا، آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے، میں مقررہ وقت پر ارم کے گھر کے سامنے آ گیا، ارم کے گھر کے ڈرائنگ روم کا باہر والا دروازہ کھلا تھا، میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ خط میں ثمرین نے جو وقت لکھا..... میں اسی مقررہ وقت پر ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ داخل ہونے کے بعد میں نے

دروازہ بند کر دیا، سامنے صوفے کے پاس شمرین کھڑی تھی، میں اس کے قریب آ گیا، وہ روتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی، میرے سینے سے لگ کر روتی رہی۔ میں اسے چُپ کراتا رہا، میں نے اسے زبردستی خود سے جدا کیا، وہ رونے کے بعد مسکرانے لگی، مجھ سے مل کر بہت خوش ہو رہی تھی۔ اس نے ڈرائنگ روم کے باہر والے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی، مجھے پکڑ کر صوفے پر اپنے ساتھ بٹھالیا، میں ڈر رہا تھا کہ ارم کے گھر والوں میں سے کوئی اندر آ سکتا ہے لیکن شمرین میں ذرا ڈر نہ تھا۔ میرے ہاتھوں کو چومتے ہوئے بولی، ڈرو نہیں، گھر میں ارم کے علاوہ کوئی نہیں، ارم کے تمام گھر والے اپنے آبائی گاؤں گئے ہوئے ہیں، شام کو واپس آئیں گے۔ تین چار گھنٹے گھر میں کوئی نہیں آئے گا، اس کمرے میں ارم تک نہ آئے گی، کہو تو اندر والے دروازے کی چٹخنی چڑھا دوں، میں نے کہا کہ بس ٹھیک ہے چٹخنی چڑھانے کی ضرورت نہیں، بس تم میرے پاس بیٹھی رہو۔ شمرین نے میرے کندھے پر سر رکھ دیا، مجھ پر انجانے گھر میں ملاقات کا جو ڈر خوف تھا، شمرین نے یہ بتا کر ختم کر دیا کہ گھر میں ارم کے علاوہ کوئی نہیں.....

میں اور شمرین ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے، جب شمرین رونے لگتی، میں اسے چپ کر دیتا، جس طرح شمرین میں ہنسنے کی عادت تھی اسی طرح رونے کی تھی، وہ روتے روتے ہنسنے لگتی..... اس دن شمرین میں وارفتگی تھی۔ میں اپنی باتوں سے اسے ہنساتا رہا، صرف اس کی مسکراہٹ دیکھنے کے لیے، وہ میرے ساتھ لگ کر بیٹھی تھی، مجھ سے ذرا دُور نہ ہو رہی تھی۔ اس ملاقات پر شمرین کی محبت میں والہانہ پن تھا، شمرین مجھ سے ایسی باتیں کر رہی تھی، جیسے اسے پتا چل چکا ہو کہ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ شمرین کو میں نے ابھی تک بتایا نہ تھا کہ آنے والی رات کو مجھے یہاں سے چلے جانا ہے، اڑھائی تین گھنٹے کی ملاقات جب اختتام پذیر ہونے لگی تو میں نے شمرین سے کہا۔ ”شمرین! میں آج رات یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

شرمین کی گہری آنکھیں میرے چہرے پر ٹھہر گئیں، اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں،
 اُداس لہجے سے بولی۔ ”کدھر جاؤ گے؟ کہاں جاؤ گے؟“
 ”جدھر بھی گیا بس چلا جاؤں گا۔“
 ”پھر بھی؟“

”میں کراچی جاؤں گا۔“
 ”کس کے پاس؟“
 ”کسی کے پاس نہیں۔“

شرمین دوبارہ رونے لگی، اسے چُپ کرانے کے بعد بڑے پیار سے مخاطب
 کیا۔ ”شرمین! میں واپس آؤں گا، میں کچھ کرنا چاہتا ہوں، کچھ بننا چاہتا ہوں، یہاں نہ
 میں کچھ کر سکتا ہوں نہ کچھ بن سکتا ہوں، وہاں میں جدوجہد کروں گا، کچھ نہ کچھ بن کر
 واپس آؤں گا۔“ شرمین نے رونا بند کر دیا۔

اس کے ہاتھوں نے میرے ہاتھوں کو تھام لیا، میں نے اسے تسلی دی کہ مجھے کچھ
 نہیں ہوگا، میں خیریت سے واپس آ جاؤں گا۔ اس ملاقات پر جب میں شرمین سے جدا
 ہونے لگا تو شرمین کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ہم دونوں صوفے سے اٹھ کر
 ڈرائنگ روم کے باہر والے دروازے کے پاس کھڑے تھے، میں باہر جانے لگا تو شرمین
 میری بانہوں میں چھپ کر رونے لگی۔ کچھ لمحوں کے بعد میں نے شرمین کو خود سے جدا
 کیا۔ میری اپنی آنکھیں اس سے جدا ہوتے وقت بھیگ گئیں، میں نے اس کی پیشانی کو
 چومنا، ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر باہر گئی میں آ گیا، چند قدم چلنے کے بعد پیچھے مڑ کر
 دیکھا، شرمین ڈرائنگ روم کے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی، اس نے ہاتھ ہلایا،
 اس کے بعد میں نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔

آنے والی رات میں نے بیگ میں دو تین کپڑوں کے جوڑے، کچھ کتابیں اور وہ رسائل ڈالے جن میں لکھتا تھا۔ رات کے گیارہ بجے کے قریب میں گھر سے نکلا، ماں دوسرے کمرے میں سوئی ہوئی تھی، میں نے الوداعی نظر ماں کے کمرے والے دروازے پر ڈالی اور گھر سے باہر آ گیا۔ اس کے بعد میں نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا، رات اندھیری تھی، چار سو ہو کا عالم تھا..... ساڑھے گیارہ بجے میں شہر جانے والی بس کے اڈے پر پہنچ گیا..... اڈے پر بس چلنے کو تیار کھڑی تھی، میں اس میں بیٹھ گیا۔ چند منٹوں کے بعد بس چل پڑی، میں اپنا گھر چھوڑ کر جا رہا تھا۔ اندھیری رات میں بس کی آواز سناتے کو درہم برہم کر رہی تھی، میں نے آگلی سیٹ کے ساتھ سر لگا دیا۔ بس کے ڈرائیور نے ٹیپ ریکارڈ چلا دیا، عطا اللہ کی درد بھری آواز کانوں میں گونجنے لگی، عطا اللہ کی آواز میں سوز تھا، مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے عطا اللہ کی آواز میں درد سوز میرے لیے ہے۔ اس نے تمام پُر سوز گیت میرے لیے گائے ہیں۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں، آنکھوں سے آنسو بہتے رہے، بس چلتی رہی، رات کے سناتے میں عطا اللہ کی آواز گونجتی رہی، عطا اللہ کی کیسٹ ختم ہوئی تو میں نے سامنے والی سیٹ سے سر اٹھایا، کھڑکی سے باہر دیکھا، باہر گھپ اندھیرا تھا، سڑک کے ساتھ ساتھ درخت نظر آرہے تھے جن میں اکثریت کیکر کے درختوں کی تھی۔ کیکر کے درخت پیچھے بھاگ رہے تھے، ڈرائیور نے کیسٹ کی دوسری سائیڈ لگا دی، میں نے اپنا سر آگلی سیٹ کے ساتھ نہ لگایا، کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا، باہر اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ مجھے روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہ دے رہی تھی، صرف دل میں ایک دیا جل رہا تھا، وہ دیا محبت کا تھا، جس نے میرے دل کے گھر وندے کو روشن کیا ہوا تھا، یہ دیا شمرین کی محبت کی صورت میرے اندر جل رہا تھا۔ اندھیری رات میں ہوا بس سے ٹکرا کر زنائے کی آواز پیدا کر رہی تھی، مجھے شمرین شدت سے یاد آ رہی تھی، حالانکہ دن کو دو اڑھائی گھنٹے اس کے پاس رہا، اس سے پیار کیا، ہر طرح کی باتیں کیں،

اس کے باوجود جاتے ہوئے شمرین مجھے بہت یاد آرہی تھی۔ اس میں کچھ عطا اللہ کی آواز کا بھی اثر تھا۔

بس نے مجھے فجر کے وقت بہاولپور اتارا، بہاولپور میں میرا قلمی دوست چوہدری حسنین رہتا تھا، اس نے کافی خطوں میں دعوت دی کہ مجھ سے ملنے کے لیے آؤ، میں اس سے مل کر کراچی جانا چاہتا تھا، بیگ میرے کندھے سے لٹکا ہوا تھا، صبح ہونے تک میں بہاولپور کی سڑکوں پر بلا مقصد چلتا رہا، جب دن نکل آیا، تب میں نے چوہدری حسنین کے پاس جانے کا ارادہ کر لیا، چوہدری حسنین، بہاولپور کے ایک گاؤں میں رہتا تھا، اس نے خط میں اپنے گاؤں کا پتہ سمجھا دیا تھا، بس میں بیٹھ کر اس کے گاؤں پہنچنا تھا، ایک رستے میں بیٹھ کر گاؤں کی طرف جانے والے چھوٹے سے اڈے پر آ گیا۔ اس اڈے پر بھابھی نہ تھی، ایک پرانے ماڈل کی بس کھڑی تھی، بس میں داخل ہونے سے پہلے میں نے اس اڈے کے ایک غریبانہ ہوٹل سے ناشتا کیا۔ ناشتا کرنے کے بعد پرانے ماڈل کی بس میں بیٹھ گیا۔ اندازاً آدھے گھنٹے کے بعد بس چلی، آدھے گھنٹے کے بعد بس نے مجھے چوہدری حسنین کے گاؤں کے اسٹاپ پر اتارا، گاؤں کے چھوٹے سے اسٹاپ پر میں تنہا ہی اتر ا تھا۔ جاتی بس کو ایک نظر دیکھنے کے بعد میں گاؤں کی طرف جانے والی سڑک پر چل پڑا، اندازاً ایک کلومیٹر چلنے کے بعد میں گاؤں میں داخل ہوا، چوہدری حسنین نے مجھے اپنے گھر کا مکمل ایڈریس سمجھایا تھا، اس کے باوجود میں نے ایک دکاندار سے چوہدری حسنین کے گھر کا پتا پوچھا، اس نے اشارے سے مجھے چوہدری حسنین کا گھر بتایا۔ میں سیدھا چوہدری حسنین کے گھر کے دروازے پر آ گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا، دروازہ کھولنے والا چوہدری حسنین ہی تھا، میرے پاس اس کی تصویر تھی، میں نے پہلی نظر میں ہی اسے پہچان لیا، اس نے بھی مجھے پہچان لیا، گرم جوشی سے ملا، ملنے کے بعد مجھے گھر کے ساتھ بنے ڈیرے پر لے آیا، ڈیرے کے صحن میں ایک میز اور

کچھ کرسیاں پڑی تھیں، اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا کہا، اس نے مجھ سے بیگ لے کر ڈیرے کے اندر رکھ دیا، میں کرسی پر بیٹھ گیا، چوہدری حسنین، بیگ رکھنے کے بعد اپنے گھر میں چلا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ گھر کیوں گیا ہے۔

کچھ وقت کے بعد چوہدری حسنین مسکراتا ہوا واپس آ گیا، میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا، ہماری آپس میں باتیں شروع ہو گئیں، میں نے اس سے کچھ نہ چھپایا، میں نے اسے بتا دیا کہ میں گھر سے بھاگ کر آ رہا ہوں، چوہدری حسنین وقتی طور پر کچھ پریشان ہو گیا، پھر پہلے کی طرح مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا، باتیں کرنے کے دوران وہ گھڑی کی طرف بھی دیکھتا رہا، پھر وہ کرسی سے اٹھا اور اپنے گھر کے اندر چلا گیا، اس بار جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے تھی، اس میں روٹی سالن کے علاوہ کچھ دوسرے لوازمات بھی تھے۔ اس نے ٹرے میز پر رکھی، خود کرسی پر بیٹھ کر پلیٹوں میں سالن ڈالنے لگا، ہم دونوں نے مل کر کھانا کھایا، کھانے کے بعد وہ برتن اٹھا کر گھر کے اندر چلا گیا، اس بار جب واپس آیا تو چائے کا تھرماس اور کپ لے کر آیا، اس نے کپوں میں چائے ڈالی، ہم دونوں چائے کی چسکیاں لیتے رہے، ساتھ باتیں بھی کرتے رہے۔ چوہدری حسنین مجھے سمجھاتا رہا، میں اس کی باتیں سنتا رہا، اپنی سناتا رہا، اس نے مجھے کہا۔ ”تم یوں کراچی نہ جاؤ، یہیں میرے پاس رہو۔ میں تمہیں بہادپور میں کوئی پرائیویٹ نوکری دلوا دوں گا۔“

میں نہ مانا، میں نے جواب میں کہا کہ میں ہر صورت کراچی جاؤں گا۔ اس نے پوچھا ”کس کے پاس؟“ میں نے جواب میں کہا ”کسی کے پاس نہیں،“ چوہدری حسنین میرے لیے اُداس ہو گیا کیونکہ میں کراچی جانے پر بضد تھا، کراچی کے متعلق اس نے مجھے بہت کچھ بتایا کہ وہ ایسا شہر ہے جہاں واقفیت کے بغیر وہاں جانا بے وقوفی اور کم عقلی ہے۔ وہاں جرائم پیشہ لوگوں کے گڑھ ہیں اس کے بار بار سمجھانے کے باوجود میں

بصد رہا، تھک ہار کر اس نے کہا، 'ٹھیک ہے دوست! جیسے تمہاری مرضی، دُعاؤں کے علاوہ اس نے مجھے کراچی کے دوا ایڈریس دیئے جو اس کے جاننے والوں کے تھے اس نے مجھے تاکید کی کہ سیدھا ان میں سے کسی کے پاس جانا، وہ تمہیں کوئی نہ کوئی کام دلوا دیں گے۔ میں نے مرہوتا ایڈریس والا کاغذ جیب میں ڈال لیا، میں گھر سے عہد کر کے چلا تھا کہ کراچی کسی کے پاس نہیں جاؤں گا، کسی کا احسان نہیں لوں گا، دن کے تین بجے تک چوہدری حسنین کے پاس رہا، تین بجے میں نے اس کو بیگ لانے کو کہا، وہ ڈیرے کے اندر سے بیگ اٹھا لایا۔ چوہدری حسنین مجھے بہاؤنیو رتک چھوڑنے آنا چاہتا تھا پر میں نے اسے روک دیا، گاؤں کے اسٹاپ تک اسے ساتھ لایا، بس آنے تک ہم ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے، چوہدری حسنین میرے یوں چلے جانے پر کچھ اُداس تھا، ظاہراً مسکرا رہا تھا، پھر بس آگئی، ہم الوداعی گلے ملے، میں بس میں سوار ہو گیا، بس چل پڑی، چوہدری حسنین پیچھے گاؤں کے اسٹاپ پر رہ گیا۔ میں نے بس کی کھڑکی سے سر نکال کر اسے دیکھا، اس نے ہاتھ بلایا، جواب میں نے بھی ہاتھ بلایا، ہاتھ ہلانے کے بعد کھڑکی سے باہر نکلا، چہرہ اندر کر لیا۔

اس بس نے مجھے بہاؤنیو رتارا، اس اڈے پر جس کے ایک غریبانہ ہوٹل سے میں نے ناشتا کیا تھا، یہاں سے میں رکشے میں بیٹھ کر اسٹیشن پر آ گیا، اسٹیشن پر کافی گہما گہمی تھی، بچوں پر مسافر بیٹھے تھے، ان کے قریب سفری بیگ رکھے ہوئے تھے۔ اسٹیشن کی کینٹین پر چائے کی بھاپ اُڑ رہی تھی، کینٹین کے ساتھ رسائل کا اسٹال تھا، اسٹال پر مختلف قسم کے رسائل رکھے ہوئے تھے، میں اسٹال کے سامنے کچھ وقت رکا رہا، ان میں وہ رسائل بھی پڑے تھے جن میں 'میں لکھتا تھا۔ وہ رسائل میرے بیگ میں بھی تھے، کچھ دیر رسائل دیکھنے کے بعد آگے چل پڑا، ایک خالی بینچ پر بیٹھ گیا، بینچ پر بیٹھ کر سوچتا رہا، پھر اٹھا، ٹکٹ والے کمرے کے پاس آ گیا، کراچی کا ٹکٹ لیا، شالیمار ایکپریس کے

آنے میں ابھی بیس منٹ باقی تھے، میں بیس منٹ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر چل پھر کر گزرا بنا چاہتا تھا، بیچ پر بیٹھنے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ بیس منٹ پلیٹ فارم پر چہل قدمی کرتا رہا، بیگ کندھے سے اٹکا ہوا تھا، میں دوسروں کی طرح مسافر لگ رہا تھا، اسٹیشن پر ہجوم بڑھتا جا رہا تھا، بیس منٹ کے بعد شالیمار ایکسپریس اپنا مخصوص بارن بجاتی ہوئی اسٹیشن پر آ کر رکی، ایک گھمسان سا مچ گیا، ہر کسی کو اپنی پڑی ہوئی تھی۔ گاڑی کو چند منٹ رکنا تھا، گاڑی سے اترنے والے مسافر کافی مشکل میں تھے کیونکہ چڑھنے والے دروازوں سے چپے ہوئے تھے، میں بڑی مشکل سے ایک ڈبے کے اندر داخل ہوا، ڈبے کے اندر کافی رش تھا، بیٹھے کم کھڑے زیادہ تھے، سیٹوں پر بیٹھے مسافر نے چڑھنے والے مسافروں کو عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے، گاڑی چند منٹ رکنے کے بعد چل پڑی، جس ڈبے میں میں تھا، اس میں کافی رش تھا، سیٹ ملنے کی امید نہ تھی، نیچے بیٹھنے پر سنجیدگی سے غور کر رہا تھا، کیونکہ کھڑے مسافر نیچے بیٹھ رہے تھے، میں دروازے کے قریب کھڑا تھا، کچھ مسافر دروازے کو بند کر کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی میں بھی نیچے بیٹھ گیا۔

شالیمار ایکسپریس، سرپٹ بھاگی جا رہی تھی، ان دنوں شالیمار ایکسپریس سب سے تیز رفتار گاڑی تھی، گاڑی چھوٹے اسٹیشنوں کو لفٹ نہ کر رہی تھی، بڑے اسٹیشنوں پر رکنا اس کی مجبوری تھی، میں خاموش بیٹھا تھا، آس پاس بیٹھے مسافروں سے میں کوئی بات نہ کر رہا تھا، آنے والے وقت کے بارے میں سوچ سوچ کر دل میں ہول اٹھ رہے تھے۔ ذہن انجانے اندیشوں اور وسوسوں میں پڑا ہوا تھا۔ گاڑی کی رفتار کافی تیز تھی، سندھ کا علاقہ شروع ہو گیا، جس اسٹیشن پر گاڑی رکتی، کچھ مسافر چڑھتے، زیادہ اترتے، ڈبے کا دروازہ کھول دیا گیا۔ میں دروازے کے پاس بیٹھا تھا، موسم خوشگوار لگ رہا تھا، پنجاب میں سردی کی شروعات تھی جبکہ سندھ کا موسم تھوڑا تھوڑا گرم تھا..... کھلے

دروازے سے ڈبے کے اندر آتی ہوا کافی خوشگوار لگ رہی تھی، مشرق سے چاند نکلتا نظر آرہا تھا، کافی فسوں خیز لگ رہا تھا۔ کبھی درختوں کی اوٹ میں چلا جاتا، کبھی صاف نظر آنے لگتا۔ میری آنکھیں اسے محویت سے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے یہ سوچنا چھوڑ دیا کہ آگے میرے ساتھ کیا ہوگا، تیز رفتار گاڑی میں رات کے وقت چاند بہت سُند لگ رہا تھا۔

حیدر آباد آیا تو چاند شہر کی روشنیوں میں گم ہو گیا، شہر کی بلڈنگیں اس کے آگے آئیں، ڈبے میں واحد میں تھا جو ابھی تک نیچے بیٹھا تھا، کئی سیٹیں خالی ہو چکی تھیں، میں چاند کو دیکھتا آیا، اس لیے دروازے کے پاس سے نہ اٹھا۔ جب چاند حیدر آباد کی روشنیوں میں گم ہو گیا تب میں اٹھا۔ بیگ اٹھایا خالی سیٹ کی تلاش کے لیے ادھر ادھر دیکھنے لگا، ایک سفید داڑھی والے بابا نے مجھے اپنے ساتھ خالی سیٹ پر بیٹھنے کا کہا، میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ گاڑی دوبارہ چل پڑی، ڈبوں میں رش ختم ہو چکا تھا، صرف سیٹوں پر مسافر بیٹھے تھے۔ سفید داڑھی والا بابا کچھ وقت خاموش رہا، پھر مجھ سے باتیں کرنے لگا، میں باتیں کرنے سے کتر رہا تھا۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں کراچی کہاں اور کس کے پاس جا رہا ہوں، میرے پاس اس کے سوالوں کا جواب نہ تھا۔ میں نے کافی ٹال مٹول کی پر اس کی ساری توجہ مجھ پر مرکوز تھی، آخر تنگ کر میں نے کہہ دیا کہ میں کراچی کسی کے پاس نہیں جا رہا، وہ سمجھ گیا کہ میں گھر سے بھاگ کر آ رہا ہوں، اس نے مجھے بتایا یہ گاڑی رات کے ایک یا ڈیڑھ بجے کراچی پہنچے گی، رات کے ایک، ڈیڑھ بجے تم کدھر جاؤ گے؟ کراچی اتنا بڑا شہر ہے، تم آسانی سے گم ہو جاؤ گے، کسی جرائم پیشہ گروہ کے ہاتھ لگ جاؤ گے، اس نے مزید مجھے نہ ٹولا، شاید اسے خطرہ محسوس ہو گیا تھا کہ اگر زیادہ پوچھوں گا تو میں ادھر ادھر کھسک سکتا ہوں۔ وہ سامنے والی سیٹوں پر بیٹھے مسافروں سے باتیں کرنے لگا، دوسروں سے باتیں کرنے کے باوجود اس کی تمام توجہ

مجھ پر تھی، میں بار بار سفید داڑھی میں چھپے اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا، مجھے کافی مہذب اور شریف لگ رہا تھا.....

جب گاڑی کراچی کے مضافات میں پہنچی تو اس کے چہرے کا رخ میری طرف ہو گیا۔ جب گاڑی کینٹ اسٹیشن پر رکی تو اس نے میرے بائیں ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا، میرے دائیں کندھے پر بیگ تھا، اس نے سیٹ کے نیچے سے اپنا بیگ اٹھایا، بیگ اٹھاتے وقت بھی اس نے میرا ہاتھ نہ چھوڑا، جب ہم ڈبے سے اترنے لگے، وہ پہلے اتر ا۔ جب میں اتر تو اس نے دوبارہ میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا، گاڑی سے باہر آ کر اس کے ہاتھ کی گرفت میرے ہاتھ پر زیادہ سخت ہو گئی تھی، میں نے جواب میں کوئی مزاحمت نہ کی، اس کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ کراچی کے متعلق باتیں کرتا ہوا، مجھے لے کر اسٹیشن سے باہر آ گیا، باہر آ کر بڑبڑایا، پہلے بس پر جاتا تھا، آج تم ساتھ ہو اس لیے رکشے پر چلیں گے۔ اس نے ایک رکشے والے سے بات کی، رکشے والے نے رکشے میں بیٹھنے کا اشارہ کیا، اس نے رکشے میں مجھے اپنے ساتھ بٹھالیا۔ رکشہ کراچی کی سڑکوں پر دوڑتا رہا۔ اونچی اونچی بلڈنگیں نظر آرہی تھیں، چاروں طرف روشنیاں ہی روشنیاں تھیں۔ میں حیرت سے اونچی اونچی روشن بلڈنگوں کو دیکھ رہا تھا، ایک اونچی عمارت کے سامنے اس نے رکشے والے کو رکنے کا کہا۔ رکشہ رُک گیا، اس نے رکشے والے کو کرایہ دیا، رکشہ آگے کو چل دیا، اس نے پھر میرا ہاتھ پکڑ لیا، اسے ابھی تک خطرہ تھا کہ میں بھاگ سکتا ہوں۔ ہم ایک اونچی عمارت میں داخل ہو گئے، سیڑھیوں سے دوسری منزل پر آئے، اس نے مجھے چھوڑ کر ایک دروازے پر دستک دی، دوسری دستک پر دروازہ کھل گیا، دروازہ کھولنے والا ایک نوجوان تھا، اس کی عمر پچیس چھبیس سال کے لگ بھگ تھی، اس نے باباجی کے ساتھ مجھے دیکھا تو جلدی سے اندر جا کر ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولا.....

بابا جی مجھے لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا، ڈرائنگ روم میں فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ میں نے جوتے اتارے ایک طرف صوفے رکھے ہوئے تھے۔ نوجوان نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا کہا، میں چپ کر کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ نیچے قالین پر ایک اور آدمی سویا ہوا تھا، چہرے سے اس کی عمر نوجوان سے زیادہ لگ رہی تھی، نوجوان نیچے قالین پر بیٹھ گیا، بیٹھنے کے بعد اسے یاد آیا، اس نے اٹیچ باتھ کی طرف اشارہ کر کے کہا، تم باتھ روم سے ہو آؤ، میں تمہارے لیے کھانا لے کر آتا ہوں۔ میں باتھ روم میں چلا گیا، باتھ روم سے باہر آیا تو سامنے صوفے پر بابا جی بیٹھے تھے، اس نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا کہا، پر میں نیچے قالین پر بیٹھ گیا۔

”تم کھانا کھا کر سو جانا، کل بات کریں گے۔ پریشان نہیں ہونا یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔“ اتنا کہتے ہوئے وہ اٹھا، اٹھ کر اندر چلا گیا، چند منٹوں کے بعد وہ نوجوان کھانا لے کر آ گیا، مجھے واقعی بھوک لگی ہوئی تھی، اس نوجوان نے میرے آگے کھانا رکھا، کھانا رکھنے کے بعد میرے سامنے بیٹھ گیا، میں کچھ شرمارا ہوا تھا، نوجوان نے میرا حوصلہ بڑھایا، سیر ہو کر کھانا کھانا، میں کھانا کھانے لگا، کھانے کے دوران میں نے اس سے اس کا نام پوچھا، اس نے اپنا نام فاروق بتایا، جو سویا ہوا تھا، اس کا نام صفر تھا، فاروق نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ یہ میرا بڑا بھائی ہے، ہم سب گھر والے اسے بابو کے نام سے پکارتے ہیں، لیڈیز پرس بنانے کا ایک چھوٹا سا اس کا اپنا کارخانہ ہے۔ میں بابا جی کے ساتھ دکان پر ہوتا ہوں، نیچے اس بلڈنگ میں ہماری جیولری کی دکان ہے، لاہور تک ہمارا مال سپلائی ہوتا ہے۔ بابا جی کا ہر دوسرے ہفتے لاہور کا چکر لگتا ہے، میں نے اسے اپنا نام بتا دیا، کھانا کھانے کے بعد وہ چپ ہو گیا، اس نے مجھ سے کوئی سوال نہ کیا، کھانے کے برتن اٹھا کر اندر چلا گیا، میں نیچے قالین پر لیٹ گیا، لیٹتے ہی مجھ پر نیند کا غلبہ طاری ہو گیا، فاروق کے واپس آنے سے پہلے میں سو چکا تھا۔

اگلے دن میں کچھ دیر سے اٹھا، سامنے صوفے پر فاروق اور صفدر کو بیٹھے پایا، شاید وہ میرے جاگنے کا انتظار کر رہے تھے، میں اٹھا اور ہاتھ روم میں چلا گیا، میں منہ ہاتھ دھو کر ہاتھ روم سے باہر آ گیا، اب صوفے پر فاروق اور صفدر نہیں بابا جی بیٹھے تھے۔ فاروق اور صفدر نیچے قالین پر بیٹھے تھے، میں بھی ان کے ساتھ قالین پر بیٹھ گیا، میرے بیٹھنے کے بعد بابا جی بولے، بیٹا! میں نہیں جانتا تم کون ہو؟ کہاں کے رہنے والے ہو؟ گھر سے کیوں بھاگ کر آئے؟ میں تم سے کچھ نہیں پوچھوں گا، نہ کسی قسم کی سختی کروں گا۔ اگر تم گھر والوں سے لڑ کر آئے ہو تو میں تمہارے ساتھ چلا چلتا ہوں، میں تمہارے گھر والوں کو سمجھاؤں گا، تم واپس گھر جانا چاہو تو ہم تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آتے ہیں۔ ہم تمہیں اپنے اوپر بوجھ نہیں سمجھ رہے، تم میرے بیٹوں جیسے ہو، تم کم عمر اور ناتجربہ کار ہو، تمہارے پاس کوئی ہنر نہیں..... یہاں تمہیں کام کرنے میں کافی دُشواری پیش آئے گی، یہاں ہنر والے کی قدر ہے، بڑا بیٹا صفدر لیڈیز پرس بناتا ہے، اس کا چھوٹا سا اپنا کارخانہ ہے، تم اس کے ساتھ کام کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔ یہ تمہیں اپنے ساتھ چھوٹے بھائی کی طرح رکھے گا، جب تم کچھ سیکھ جاؤ گے پھر تمہیں کسی قسم کی تنگی نہ ہوگی۔ تمہارے پاس ہنر ہوگا، صفدر تمہارا ہر طرح سے خیال رکھے گا، تم اس سے جتنے پیسے مانگا کرو گے، تمہیں ملا کریں گے۔ ہمارا نیچے جیولری کا بھی کام ہے، پر اس کام کو سیکھنے میں تمہیں سالوں لگ جائیں گے، اب تم بتاؤ کیا کرنا چاہتے ہو؟

میں کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا، میں واپس گھر نہیں جاؤں گا، میں صفدر بھائی کے ساتھ کام کروں گا، میری رہائش کا بھی وہیں بندوبست کر دیا جائے۔ بابا جی نے صفدر کو میرا ہر طرح سے خیال رکھنے کو کہا۔

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد بابا جی اٹھ کر اندر چلے گئے..... ان کے جانے کے

بعد فاروق اٹھ کر اندر گیا، کچھ دیر کے بعد میرے لیے ناشتا لے آیا..... فاروق اور صفدر میرے اٹھنے سے پہلے ناشتا کر چکے تھے، میں کچھ دیر سے اٹھا تھا، میں نے جلدی جلدی ناشتا کیا، ناشتے کے بعد اپنا بیگ اٹھایا، فاروق سے مصافحہ کیا اور صفدر کے ساتھ ڈرائنگ روم سے باہر آ گیا۔ ہم سیڑھیوں کے ذریعے نیچے آئے، میں نے گھڑی پر ٹائم دیکھا، دن کے گیارہ بج چکے تھے، جب ہم روڈ پر آئے، صفدر نے مجھے بتایا، یہ کراچی کا صدر ہے، کافی گہما گہمی تھی، روڈ پر ٹریفک کی بھرمار تھی، ایک شور مچا تھا، گاڑیوں، بسوں کے ہارن بج رہے تھے۔ ہم نے کچھ سفر پیدل طے کیا، پھر ایک بس میں سوار ہو گئے، اندازاً آدھا گھنٹہ اس بس میں سفر کیا، پھر ایک اسٹاپ پر اتر گئے۔ میں صفدر کے ساتھ ساتھ تھا۔ روڈ کے ساتھ بنے فٹ پاتھ پر کچھ پیدل چلنے کے بعد ہم ایک بلڈنگ میں داخل ہو گئے، سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر آ گئے، صفدر نے چابی سے ایک کمرے کا دروازہ کھولا، ہم ایک بڑے کمرے میں داخل ہو گئے، اس کمرے کے ساتھ ایک چھوٹا کمرہ تھا، چھوٹا کمرہ رہائش کے طور پر تھا۔ صفدر نے چھوٹے کمرے کا دروازہ کھولا، ہم کمرے میں داخل ہو گئے، کمرے میں نیچے قالین بچھا ہوا تھا، ایک چھوٹی سی میز تھی جس پر ٹیپ ریکارڈ رکھا ہوا تھا، میں نے بیگ کندھے سے اتار کر نیچے رکھ دیا، جب میں نے نیچے بیگ رکھ دیا تو صفدر مسکراتے ہوئے بولا، اب تمہیں اس کمرے میں رہنا ہے، یہ تمہارے تصرف میں رہے گا، میں شام کے وقت گھر چلا جایا کروں گا، باقی کاریگر کام کرنے آئیں گے، شام کے وقت وہ بھی گھر چلے جایا کریں گے، اس کمرے میں صرف تمہیں رہنا ہے، اب میں تمہیں کام کے متعلق ابتدائی طور پر کچھ بتاؤں گا۔

ہم چھوٹے کمرے سے بڑے کمرے میں آ گئے، یہ کمرہ صفدر کا کارخانہ تھا، اس میں پاؤں سے چلنے والی چار مشینیں رکھی ہوئی تھیں، صفدر مجھے لیڈیز پرس کے متعلق بتانے لگا، میں بڑی توجہ سے سمجھ رہا تھا، صفدر ایک مشین پر بیٹھ گیا، میں کچھ دیر کھڑا ہا پھر

نیچے نیچے ریگزیں پر بیٹھ گیا، اس نے مجھے قینچی پکڑادی ساتھ پڑے ریگزیں پر لکیریں لگی ہوئی تھیں، اس نے مجھے ریگزیں کاٹنے کو کہا، میں قینچی سے ریگزیں کاٹنے لگا، کچھ دیر کے بعد اس کے دو کارگر آگئے، صدر نے ان سے میرا تعارف کرایا، دونوں مجھ سے مل کر خوش ہوئے۔ وہ اپنی مشینوں پر بیٹھ کر کام کرنے لگے۔ صدر مجھے ریگزیں کاٹنے کے لیے دیتا رہا، میں کاٹتا رہا، شام کے وقت دونوں کارگر اپنے گھروں کو چلے گئے، ان کے جانے کے بعد صدر بھی چلا گیا۔ کارخانے میں میں تنہا رہ گیا، میں نے بڑے کمرے کا دروازہ بند کیا اور چھوٹے کمرے میں آ گیا، لائٹ جلائی، نیچے قالین پر بیٹھ گیا، بیٹھنے کے بعد تمام کمرے کا جائزہ لیا، کمرے میں ایک بند کلاک، جالے اور دو پرانے کینڈر لگے ہوئے تھے۔ جانوں کو دیکھ کر میں اٹھا، ایک چھڑی تلاش کی اس سے کمرے کے تمام جالے صاف کیے، جالے صاف کرنے کے بعد دوبارہ قالین پر بیٹھ گیا، بیٹھنے کے بعد بڑبڑایا، کل دونوں پرانے کینڈر اُتار دوں گا۔ کلاک میں سیل ڈال دوں گا، اس کمرے میں آج میری پہلی رات ہے، آج مجھے جلدی سو جانا چاہیے۔

کمرے کے ایک طرف تکیہ اور چادر پڑی تھی، تکیہ اپنے قریب کیا، اسے سر کے نیچے رکھا، لیٹ کر چھت کو دیکھنے لگا، چھت پر پنکھا لگا ہوا تھا، تھوڑی تھوڑی گرمی محسوس ہو رہی تھی، میں نے اٹھ کر ہلکا سا پنکھا چلا دیا، سونے کی بجائے میں نے اپنا بیگ کھولا، اس میں سے ثمرین کی تصویریں نکالیں، انہیں انہماک سے دیکھنے لگا، انہیں دیکھتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو آگئے، کچھ وقت تصویریں دیکھتا رہا، پھر بیگ میں ڈال دیں۔ ثمرین مجھے شدت سے یاد آ رہی تھی، ثمرین کی یاد سے توجہ ہٹانے کے لیے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن آن کر دیا، اس میں لتا کی کیسٹ تھی، لتا کے درد بھرے گیتوں نے رہی سہی کسر نکال دی، ثمرین مجھے پہلے سے زیادہ یاد آنے لگی، میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، جب کیسٹ کی ایک سائیڈ ختم ہوئی تو میں نے ٹیپ ریکارڈر آف کر دیا..... اٹھ کر بلب

بجھایا، کمرے میں گھپ اندھیرا ہو گیا، واپس سونے کی جگہ پر آیا، تکیہ پر سر رکھا، چادر اوڑھ لی، اب کمرے میں ثمرین کی یاد اور میری خود کلامیوں کی بازگشت تھی۔

○.....○.....○

اگلے دن میں کچھ جلدی اٹھا، ساڑھے سات کا وقت تھا، اس وقت آدھا کراچی سویا ہوا تھا، میں نے کراچی کے متعلق کہیں پڑھا تھا کہ نوبے ان کی صبح ہوتی ہے۔ میں اٹھ کر کارخانے کے ہاتھ روم میں گیا، نہایا، لباس تبدیل کیا، کارخانے کو باہر سے تالا لگایا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے روڈ پر آ گیا۔ ایک گھنٹہ میں آس پاس کی سڑکوں پر چلتا رہا، سڑکوں پر ٹریفک کم تھا، جب چلتے چلتے تھک گیا، تب میں واپس آ گیا، کارخانے کا تالا کھولا، اندر بیٹھ کر صفدر بھائی کا انتظار کرنے لگا۔ صفدر دس بجے کے قریب آیا، مجھے دیکھ کر مسکرایا، مجھ سے مصافحہ کیا، ناشتے کا پوچھا..... میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”میں تو گھر سے کر کے آیا ہوں، جاؤ نیچے ہوٹل سے ناشتا کر کے آؤ، یہ کچھ پیسے رکھ لو، شام کے وقت کھانا اور صبح کے وقت ناشتا خود کر لیا کرنا۔“
اس نے مجھے پانچ سو کا نوٹ پکڑ لیا۔ میں نے کہا۔
”اتنے پیسوں کا میں کیا کروں گا؟“

اس نے جواب میں کہا۔ ”رکھ لو، انسان کی سوز و رتیں ہوتی ہیں، کسی چیز کی بھی ضرورت ہو مجھے بتا دینا، میں تمہارا استاد ہی نہیں، تمہارا بڑا بھائی ہوں۔“ میں نے پانچ سو کا نوٹ جیب میں ڈالا، تشکر سے صفدر بھائی کو دیکھتے ہوئے اٹھا، نیچے ہوٹل پر آ گیا، ناشتا کیا، ناشتا کرنے کے بعد اوپر کارخانے میں آ گیا، کارخانے میں دونوں کاریگر آچکے تھے، دونوں مجھ سے خوش اخلاقی سے ملے۔ اس کے بعد ہم اپنے اپنے کام میں بٹ گئے، پھر یہ کام روز کا معمول بن گیا۔ میں لیڈیز پرس بنانے میں مہارت حاصل کرتا گیا۔ ایک ماہ کے اندر میں نے کافی کام سیکھ لیا۔ صفدر بھائی مجھ سے بہت خوش تھے،

ایک ماہ میں ہی ان کے شانہ بشانہ کام کرنے لگا تھا۔ ثمرین کو میں نے ارم کے ایڈریس پر خط لکھ دیا تھا، اس خط میں اپنا ایڈریس بھی لکھا تھا، ایک ماہ میں ثمرین کے دو خط آچکے تھے، صفدر بھائی کو میری محبت کا کچھ کچھ پتہ چل چکا تھا، پر انہوں نے مجھ سے کچھ نہ پوچھا.....

ثمرین کے خط محبت کے لفظوں سے لبریز تھے، گاؤں میں میری گمشدگی کی باتیں ہر زبان پر تھیں، میری ماں بہت پریشان تھی۔ ثمرین خطوں میں گاؤں کے تمام حالات سے مجھے آگاہ کر رہی تھی، میرے خط اسے باقاعدگی سے مل رہے تھے۔ دو ماہ گزر گئے، میرے کام میں بہتری آتی گئی۔ اب میں مشین چلانے لگا تھا، صفدر بھائی مجھ سے زیادہ سے زیادہ کام لے رہے تھے، میں ان کی امیدوں پر پورا اتر رہا تھا وہ مجھ سے بہت خوش تھے، مجھے دوسرے کاریگروں جتنے پیسے دینے لگے تھے حالانکہ میں ابھی کام سیکھ رہا تھا۔ گزرے دو مہینوں میں، میں کراچی کے مشہور اور تفریحی مقامات دیکھ چکا تھا۔ ثمرین کے خط باقاعدگی سے ملتے رہے، میں باقاعدگی سے جواب لکھتا رہا، دو ماہ کے بعد ثمرین کے ایک خط نے میری آنکھیں بھگو دیں..... میری ماں میری گمشدگی سے بیمار ہو چکی تھی، اس کی حالت سیریس تھی، ماں کی زبان پر میرا نام تھا، ثمرین نے خط میں لکھا کہ واپس گھر آ جاؤ، تمہاری ماں تمہاری جدائی کے دکھ میں چارپائی کی ہو کر رہ گئی ہے، جتنی جلدی ہو سکے گھر پہنچو۔ ثمرین کا خط میں نے کمرے میں بیٹھ کر پڑھا، خط پڑھنے کے بعد میں کمرے سے باہر آ گیا، کارخانے میں صفدر بھائی اور دونوں کاریگر کام کر رہے تھے، میں سر جھکائے صفدر بھائی کے قریب آ گیا، خط میں ثمرین نے ماں کے متعلق جو لکھا، میں نے صفدر بھائی کو بتا دیا، صفدر بھائی نے کام بند کر دیا، دونوں کاریگر بھی کام بند کر کے میرے قریب آ گئے، صفدر بھائی، ماں کی بیماری کا سن کر پریشان ہو گیا، میں غم زدہ لہجے میں بولا۔

”صفر بھائی! مجھے گھر جانا پڑے گا، ماں کی حالت سیریس ہے۔“

صفر بھائی نے میری ہر طرح سے دلجوئی کی، میں نے اسی وقت اپنا مختصر سامان بیگ میں ڈالا، بیگ اٹھایا، دونوں کاریگروں سے ملا، میں اور صفر بھائی نیچے روڈ پر آ گئے، ایک بس میں بیٹھ کر کینٹ اسٹیشن پر آ گئے، پندرہ منٹ کے بعد گاڑی نے روانہ ہونا تھا، صفر بھائی نے ٹکٹ لی، مجھے ڈبے میں ایک سنگل سیٹ پر بٹھا دیا۔ صفر بھائی ڈبے سے اتر کر کھڑکی کی طرف آ کر کھڑے ہو گئے، وہ کافی اُداس تھے، ان کی آنکھوں میں نمی تھی، وہ مجھے اس طرح اُداس نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے پھر ہم کبھی نہ ملیں گے۔ میری آنکھیں بھیگ چکی تھیں، گاڑی چل پڑی، صفر بھائی کھڑکی کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی، وہ ہاتھ ہلاتے پیچھے رہ گئے، ان کے ہاتھ کے جواب میں، میں نے ہاتھ ہلایا، ہاتھ ہلاتے وقت میری آنکھیں دھندلا گئیں، میں نے جلدی سے آنسو پونچھے، کراچی کی بڑی بڑی بلڈنگوں کو الوداعی نظروں سے دیکھنے لگا..... گاڑی میں تمام رات مجھے نیند نہ آئی، ماں کی فکر دامن گیر رہی.....

○.....○.....○

شام کے وقت میں گاؤں پہنچا، شہرین مجھے اپنے گھر کے دروازے پر نظر نہ آئی، میں سر جھکائے اپنے گھر میں داخل ہوا، ماں چار پائی پر لیٹی ہوئی تھی، سامنے والی چار پائی پر میرا سوتیلا باپ قدیر بیٹھا تھا۔ ماں کی مجھ پر نظر پڑی تو وہ اٹھ بیٹھی، میں ماں کی چار پائی کے قریب ہوا۔ اس نے اپنے کمزور ہاتھوں سے مجھے اپنی گود میں گرا لیا، ماں رونے لگی تھی، میری آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ ماں نے پیار سے میرے چہرے کو بار بار بار چوما، سوتیلا باپ میرے گھر آنے پر خوش نہ تھا..... میں نے اس سے کوئی بات نہ کی، چار پانچ دنوں میں ہی ماں پہلے سے اچھی ہو گئی، چلنے پھرنے لگی۔ کچھ دنوں میں ہی ماں ٹھیک ہو گئی، میرے واپس آنے پر سب سے زیادہ شہرین خوش تھی..... گھر کی ختی اور

پابندی کے باوجود وہ مجھے چوری چھپے دیکھ رہی تھی..... میں ثمرین سے ملنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ پھر میں نے ثمرین کو ارم کے پتے پر ایک خط لکھا، اس خط میں میں نے ثمرین کو رات کے چار بجے قبرستان میں کھجور کے پیڑ کے نیچے ملنے کا لکھا..... خط پوسٹ کرنے کے بعد تین دن عجیب کشمکش میں گزرے۔ رات کے وقت ہماری پہلی ملاقات ہو رہی تھی ملاقات والی رات میں ذرا نہ سو سکا۔ ساڑھے تین بجے چار پائی سے اٹھا، خود کو چادر میں لپیٹا، گھر سے باہر آ گیا، چار سو گھپ اندھیرا تھا، قبرستان میں سناٹا ہی سناٹا تھا..... میں کھجور کے پیڑ کی طرف جانے والی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی پر چلتا ہوا کھجور کے پیڑ کے نیچے آ گیا اور ڈرتا ہوا کھجور کے پیڑ کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا.....

قبرستان کا ماحول کافی پراسرار لگ رہا تھا، سرکنڈوں کے بوٹے پچھلی رات کی سرد ہوا سے لہرا رہے تھے، وان کے درخت تھوڑے تھوڑے نظر آ رہے تھے سینے میں دل دھک دھک کر رہا تھا، ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ تمام وجود میں کپکپاہٹ تھی، بار بار گھڑی کو دیکھ رہا تھا، اندھیرے میں گھڑی کی سوئیاں نظر نہیں آ رہی تھیں، اس کے باوجود میں بار بار گھڑی کو دیکھ رہا تھا۔ ملاقات سے بیس پچیس منٹ پہلے کھجور کے پیڑ کے نیچے آ گیا، خدشہ تھا شاید ثمرین نہ آ سکے گی۔ قبرستان میں سکوت اور سناٹے کے سوا صرف میں تھا، کھجور کے تنے سے ٹیک لگائے ڈر رہا تھا۔ میری آنکھیں ثمرین کے گھر کی طرف سے آنے والی پگڈنڈی پر سجدہ ریز تھیں..... اس پگڈنڈی پر چل کر ثمرین کو کھجور کے پیڑ کے نیچے آنا تھا، خاموشی اور اندھیرا تھا، میری نظریں پگڈنڈی پر پنچھی ہوئی تھیں، میں قبرستان کی طرف دیکھنے سے کترار رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد پگڈنڈی پر ایک ہیولا آتا دکھائی دیا، میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا، ہیولا میرے قریب آ گیا..... جب میرے اور اس کے بیچ چند قدم کا فاصلہ رہ گیا، تب اس نے مجھے پکارا، میں نے جواب میں آہستہ سے کہا۔

”آگے آ جاؤ۔“ ثمرین میرے قریب آ گئی، اس نے خود کو سیاہ چادر میں لپیٹا ہوا تھا، آتے ہی مجھ سے لپٹ گئی، اس کا وجود کانپ رہا تھا..... قبرستان کے پراسرار سنائے میں کھجور کے پیڑ کے نیچے ثمرین مجھ سے لپٹی ہوئی تھی، وہ بے حد خوف زدہ تھی، اس کی حالت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کافی عرصے بعد ہماری ملاقات ہوئی ہے اور یہ تھی بھی قبرستان میں..... ڈر تو لگنا ہی تھا، کچھ لمحوں کے بعد میں نے اسے خود سے جدا کیا۔ ثمرین میرے سامنے بیٹھ گئی، اس کے ہاتھ میرے ہاتھوں میں تھے، اس کے باوجود ثمرین ڈر رہی تھی۔ اس نے ڈرتے ہوئے دو تین بار پگڈنڈی کی طرف دیکھا، میں نے اسے مزید اپنے قریب کر لیا، پہلے اس کے ہاتھ چومے، پھر پیشانی، رخسار اور سب سے آخر میں آنکھیں۔ آنکھیں چومنے کے بعد میں اس سے تھوڑا سا دور ہوا، اس وقت ثمرین بولی۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے، کوئی آنے جائے، اب مجھے جانے دو۔“

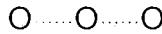
میں نے پوچھا۔ ”پھر ملنے آؤ گی؟“

”ہاں“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”کافی دیر ہو چکی ہے، اب میں جاؤں؟“

میں نے ثمرین کو کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا، میں اور ثمرین ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے، اس نے جلدی سے میرے ہاتھوں کو چوما، ہاتھوں کے بعد پیشانی کو چوما اور پگڈنڈی پر چل پڑی، چند قدم اٹھانے کے بعد رُکی، واپس مڑ کر آئی، دوبارہ میری بانہوں میں چھپ گئی، کچھ دیر میری بانہوں کے حصار میں رہی، جب وہ کسمپاسی تو میں نے اسے اپنی بانہوں کے حصار سے آزاد کر دیا۔ اس نے مجھے آنکھیں بند کرنے کا کہا، میں نے آنکھیں بند کر لیں، اس نے میری دونوں آنکھوں کو باری باری چوما۔

ثمرین میری آنکھیں چومنے کے بعد چل دی، میں آنکھیں بند کیے کھڑا رہا کہ شاید اس کے ہونٹ کا گداز میری روح کو پھولوں کی مہکی بیج پر سلائے۔ جب میں

نے آنکھیں کھولیں تو ثمرین جا چکی تھی۔ میں نے کھجور کے پیڑ کو دیکھا، ہوا سے کھجور کے پتے تھوڑے تھوڑے لہرا رہے تھے، ان پتوں سے اوپر آسمان پر ستارے چمک رہے تھے رات کے وقت ہماری پہلی ملاقات خیر و عافیت سے ہو چکی تھی، جس رستے پر چل کر کھجور کے پیڑ کے نیچے آیا، اس رستے پر چل کر واپس گھر آ گیا، کمرے میں آ کر چار پائی پر لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی۔



پھر ملاقاتوں کا ایک سلسلہ چل پڑا، ہم ہر ہفتے ملنے لگے، ایک ماہ میں تین بار ضرور ملتے، ملاقات سے دس پندرہ منٹ پہلے میں کھجور کے پیڑ کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا۔ چند منٹ بیٹھنے کے بعد اپنے اوپر سے چادر اتارتا اور نیچے زمین پر بچھا دیتا۔ چادر بچھانے کے بعد گڈنڈی کی طرف دیکھنے لگتا۔ ثمرین جب گڈنڈی پر نظر آنے لگتی تو میں کھڑا ہو جاتا، وہ رُک کر مجھے پکارتی، میں جواب میں اسے آگے آنے کا کہتا، ثمرین میرے قریب آ جاتی، اس نے خود کوشال میں لپیٹا ہوتا، وہ آتے ہی مجھ سے لپٹ جاتی، میرے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اس کی پیٹھ پر آپس میں مل جاتیں..... کچھ سے وہ مجھ سے لپٹی رہتی پھر میں اسے خود سے جدا کرتا اور نیچے بچھی چادر پر اسے بیٹھنے کا کہتا۔ ثمرین مجھے پُرستائش نظروں سے دیکھنے لگتی، بولنے میں پہل میں کرتا، اس سے پوچھتا ”ناراض تو نہیں ہو؟“ ثمرین نفی میں سر ہلاتی..... ہر ملاقات پر ثمرین کی مٹھی میں خط ہوتا، میں اس سے خط کا پوچھتا تو وہ مسکرا کر میرے ہاتھ میں خط تھما دیتی، اس کا خط جیب میں ڈالنے سے پہلے اسے اپنا خط نکال کر دیتا، پھر اس کا خط جیب میں ڈال لیتا۔ ہر ملاقات پر ثمرین کہتی۔

”مجھے سب سے زیادہ تمہاری آنکھیں پسند ہیں..... تمہاری آنکھوں میں میری

کل کائنات چھپی ہے۔“

میں ہر ملاقات پر اس سے پوچھتا ”مجھ سے شادی کرو گی؟“ ثمرین مسکراتی ہوئی جواب دیتی ”ہاں..... ہاں..... ہاں.....“ وہ تین بار ہاں کرتی، اس کے باوجود میں ہر ملاقات پر اس سے پوچھتا۔

ثمرین نے کئی بار کہا ”تم بار بار شادی کی بات کیوں کرتے ہو؟ جب میری شادی ہوئی ہی تم سے ہے کیا یقین نہیں آتا؟“ میں جواب میں مسکرا دیتا، ہر ملاقات پر مجھے شادی والا سوال یاد رہتا تھا، پندرہ بیس منٹ کی ملاقات کے بعد ثمرین اٹھتی اور پیگڈنڈی پر چل پڑتی، چند قدم چلنے کے بعد رکتی واپس مڑ کر آتی، میں سمجھ جاتا کہ واپس کیوں آئی ہے۔ جب اس کا چہرہ میرے چہرے کے قریب ہونے لگتا تو میں آنکھیں بند کر لیتا، وہ باری باری میری دونوں آنکھیں چومتی اور پھر پیگڈنڈی پر چل پڑتی، میں کھجور کے پیڑ کے نیچے کھڑا ہو کر اسے دیکھتا رہتا، جب وہ اندھیرے میں غائب ہو جاتی تو میں نیچے پکھی چادر کو اٹھاتا، اسے جھاڑتا، اپنے اوپر پلٹتا اور قبرستان کے اوپر سے ہوتا ہوا اپنے گھر آ جاتا۔



کچھ ماہ اور بیت گئے، ان قبرستان میں ہونے والی ملاقاتوں نے ہم میں مزید بے قراری پیدا کر دی، میں ہر وقت ثمرین کے خیالوں میں کھویا رہتا، ثمرین کی حالت بھی میرے جیسی تھی، گاؤں کے ہر گھر میں ہماری محبت کی باتیں ہونے لگی تھیں، سب کو باتیں کرنے کے لیے ایک موضوع مل گیا تھا۔ ہماری بدنامی میں کوئی کسر نہ رہی، میں راتوں کو جاگنے لگا، جہاں پہلے دس گیارہ بچے سوتا تھا، ڈھائی بجے سونے لگا، میں سوچ سوچ کر دُبا ہو رہا تھا۔

ثمرین کے گھر والوں نے اس پر ہر طرح کی پابندی عائد کر دی تھی، اب وہ مجھے اپنے گھر کے دروازے پر نظر نہیں آتی تھی، ہماری رات کے پچھلے پہر ملاقاتیں ہو رہی

تھیں ڈیڑھ دو ہفتے کے بعد ہم ضرور ملتے۔ ایف۔ اے کے بعد ثمرین نے بی۔ اے میں داخلہ لے لیا، مجھے غم روزگار نے کافی پریشان کیا ہوا تھا، باوجود تلاش کے مجھے کہیں نوکری نہ ملی..... میرے مزاج میں ہی نہیں میری تحریروں میں بھی تلخی آ گئی..... ان دنوں میرے قلمی دوست شجاعت کے تسلسل سے خط آنے لگے۔ میں نے ایک خط میں اپنے موجودہ دیگرگوں حالات کے متعلق لکھ دیا۔ اب اس کے ہر خط میں یہ لکھا ہوتا کہ میرے پاس آ جاؤ ”خوب گزرے گی جومل بیٹھیں گے دیوانے دو۔“ اس کے ہر خط میں اصرار تھا، پھر میں نے اس کے پاس جانے کا تہیہ کر لیا..... شجاعت کے پاس جانے سے پہلے جب رات کو میری اور ثمرین کی ملاقات ہوئی تو میں نے اسے بتا دیا کہ میں شجاعت کے پاس جا رہا ہوں، میرے جانے کا سن کر ثمرین کچھ اُداس ہو گئی..... پھر اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

”ٹھیک ہے چلے جاؤ پردہاں کے ہو کر نہ رہ جانا..... واپس آ جانا.....“

میں نے اسے تسلی دی کہ میں واپس آ جاؤں گا..... میں اچھے دنوں کی اُمید لے کر اس کے پاس جا رہا ہوں..... اس ملاقات پر جدا ہوتے وقت ثمرین کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں نے اپنی انگلیوں کے پوروں سے اس کے آنسو پونچھے، پھر وہ پگڈنڈی پر چلتی ہوئی اندھیرے میں غائب ہو گئی..... میں نے نیچے کچھی چادر اٹھائی، جھاڑنے کے بعد اپنے گرد لیٹی اور بڑبڑاتا ہوا گھر آ گیا، اس رات میری بڑبڑاہٹ میں اُداسی تھی۔

○.....○.....○

اگلے دن میں نے ثمرین کے گھر کے آگے کافی چکر لگائے، شام کے وقت ثمرین مجھے اپنے گھر کے باہر والے دروازے پر کھڑی نظر آئی، مجھے دیکھ کر مسکرائی، اس نے پہلے کی طرح ہاتھ ہلایا۔ اس کے ہاتھ ہلانے کی عادت ابھی تک نہیں گئی تھی، ہاتھ ہلانے کے بعد وہ اپنے گھر کے اندر چلی گئی، میں نے اپنے گھر آ گیا۔ میں نے ماں کو نہیں بتایا کہ میں

اپنے دوست شجاعت کے پاس جا رہا ہوں رات کے بارہ بجے میں نے بیگ میں کچھ کتابیں اور دو تین کپڑوں کے جوڑے ڈالے بیگ اٹھایا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ دوسرے کمرے میں ماں تھی اس کمرے کا دروازہ بند تھا میں نے اسے یاسیت سے دیکھا میں ماں کو بتائے بغیر گھر سے جا رہا تھا، الوداعی نظر سے کمرے کے دروازے کو دیکھنے کے بعد گھر سے باہر آ گیا۔ سردی کا موسم تھا سرد ہوا چل رہی تھی میں نے چادر کو صحیح طرح سے لپیٹ لیا، ثمرین کے گھر کے سامنے آ کر میرے قدم رُک گئے میں نے ثمرین کے گھر کی طرف دیکھا، ثمرین کا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا، ثمرین کے اندھیرے میں گھرے گھر کو دیکھنے کے بعد میرے قدم شہر کی جانب جانے والی سڑک پر اٹھنے لگے.....

آدھے گھنٹے کے پیدل سفر کے بعد میں اڈے پر پہنچ گیا، اڈے پر فیصل آباد جانے والی بس کھڑی تھی..... ٹکٹ لے کر میں بس میں بیٹھ گیا، میرے ساتھ والی سیٹ پر ایک بابا آ کر بیٹھ گیا، اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی یہی میں چاہتا تھا کہ رستے میں وہ مجھ سے کوئی بات نہ کرے، بس چل پڑی، میں کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھنے لگا، باہر گھپ اندھیرا تھا، سڑک کے ساتھ قطار درخت نظر آ رہے تھے۔ بس، مغرب سے مشرق کی طرف بھاگی جا رہی تھی، میں کھڑکی سے مشرق کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا، ابھی پچھلی رات کا چاند نہیں نکلا تھا، میں پچھلی رات کا چاند دیکھنا چاہتا تھا..... سڑک کے ساتھ پیچھے کی طرف بھاگتے درخت نظر آ رہے تھے، کچھ وقت میں کھڑکی سے باہر پیچھے بھاگتے درختوں کو دیکھتا رہا پھر اگلی سیٹ کی پشت پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

جب میری آنکھیں کھلیں صبح کے آثار نظر آ رہے تھے، بس شہر کے مضافات میں داخل ہو چکی تھی۔ بس فیصل آباد پہنچ چکی تھی، ایک بورڈ پر فیصل آباد لکھا ہوا تھا۔ میں نے زیادہ سفر سو کر کیا، جب بس فیصل آباد کے اڈے پر رُکی تو صبح ہو چکی تھی، میں بیگ اٹھا کر

بس سے اُتر آیا۔ اڈے کے ایک غریبانہ ہوٹل سے صبح کا ناشتا کیا، ناشتے کا بل ادا کرنے کے بعد میں نے اُس بس کی تلاش شروع کر دی جو شجاعت کے گاؤں سے گزر کر آگے کسی شہر کو جاتی تھی۔ شجاعت نے خط میں مجھے تفصیل سے سمجھا دیا تھا بلکہ خط میں اس نے نقشہ بنا کر بھیجا تھا کہ اڈے پر تمہیں اس بس میں بیٹھنا ہے، گاؤں کے اسٹاپ پر اُترنا ہے، مجھے پتہ زبانی یاد ہو چکا تھا۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد مجھے وہ بس مل گئی جس نے مجھے شجاعت کے گاؤں پہنچانا تھا، میں بس میں داخل ہو گیا، بس میں اکاؤنٹر کا مسافر تھے ان میں زیادہ تر دیہاتی تھے اندازاً آدھے گھنٹے کے بعد بس چلی۔ بس کی رفتار کافی سُست تھی، روڈ بھی سنگل تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد شجاعت کے گاؤں کا اسٹاپ آیا، بس سے اس اسٹاپ پر میں اکیلا ہی اُترا تھا، بس مجھے اتارنے کے بعد آگے چل دی۔

میں نے دائیں بائیں دیکھا، سڑک کے دونوں اطراف کپاس اور دھان کی فصلیں تھیں، میں اس راستے پر چل پڑا، دور گاؤں کے آثار نظر آرہے تھے، کچھ دیر کے بعد میں گاؤں میں داخل ہو گیا، گاؤں میں داخل ہوتے وقت میری نظر اپنے ہم عمر ایک نوجوان پر پڑی، شاید اس نے مجھے دیکھ لیا تھا، تبھی تو وہ رک گیا، قریب پہنچ کر میں نے اسے سلام کیا، وہ مجھے بااخلاق انداز سے ملا، میں نے اس سے شجاعت کے گھر کا پوچھا، اس نے جواب میں کہا، شجاعت میرا رشتہ دار ہے، رات کو میں اس کے پاس بیٹھا رہا، اس نے تمہاری کافی باتیں کیں..... وہ تمہارا شدت سے منتظر ہے، میرے ساتھ آؤ۔ میں اس نوجوان کے ساتھ چل پڑا، دو بڑی گلیوں کے بعد ہم ایک تنگ گلی میں آگئے، اس گلی کے ایک دروازے پر آ کر اس نے مجھے رکنے کا کہا..... وہ گھر کے اندر چلا گیا، میں بیٹھک کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا، کچھ دیر کے بعد بیٹھک کا دروازہ کھلا، بیٹھک کا دروازہ کھولنے والا شجاعت تھا، اس نے مجھے اپنی مانہوں میں بھر لیا.....

اس کے خلوص کی شدت مجھے اس کی مضطرب حالت سے محسوس ہو رہی تھی، ملنے

کے بعد اس نے میرا بیگ کندھے سے اُتارا اور مجھے بیٹھک میں آنے کا کہا۔ میں اس کے پیچھے بیٹھک میں داخل ہو گیا، بیٹھک میں کوئی نہ تھا، وہ نوجوان مجھے پہنچا کر شاید واپس چلا گیا تھا۔ بیٹھک میں ایک بیڈ، ایک چارپائی، چار کرسیاں اور ایک میز تھی، شجاعت نے مجھے بیڈ پر بیٹھنے کا کہا۔ میں بیٹھنے کے بعد کمرے کا جائزہ لینے لگا، شجاعت مجھے غور سے دیکھ رہا تھا، اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں میرے لیے پیار ہی پیار تھا، کچھ رسمی باتوں کے بعد وہ اٹھ کر اندر چلا گیا۔ میں بیڈ پر لیٹ گیا، کمرے کی دیواروں کو غور سے دیکھنے لگا۔ یہاں قدرتی مناظر کی خوبصورت پورٹریٹ لگی ہوئی تھیں، میری آنکھیں ان کو اسہاک سے دیکھ رہی تھیں۔ جب میں بیٹھک کا تمام جائزہ لے چکا تب شجاعت بیٹھک میں آیا، اس کے ہاتھوں میں ٹرے تھی، جس میں بسکٹ اور چائے کا تھرماس تھا، شجاعت ٹرے میز پر رکھنے کے بعد سامنے چارپائی پر بیٹھ گیا، اس نے پیالیوں میں چائے ڈالی، مجھے اپنی طرف متوجہ کیا، بولا۔

”کھانے میں کچھ دیر ہے، تب تک چائے کا دور چلے گا۔“ ہم دونوں بسکٹ کھانے، چائے پینے کے دوران باتیں کرتے رہے، ہم ایک دوسرے سے بلا تکلف باتیں کر رہے تھے، میری تمام جھجک دور ہو چکی تھی، چائے ختم کی تھی کہ بیٹھک میں شجاعت کی ماں آ گئی۔ میں بیڈ سے اٹھنے لگا تو اس نے مجھے بیٹھنے کا کہا، اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا پھر میرے پاس بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس نے شفقت اور پیار سے میری بلائیں لیں، اس کے لہجے میں میرے لیے پیار تھا۔ چند منٹوں کے بعد جو شخص بیٹھک میں داخل ہوا، وہ شجاعت کا باپ تھا، اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی، اس نے مجھ سے مصافحہ کیا، مصافحے کے بعد میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میرے ساتھ بیڈ پر بیٹھ گیا۔ ایک طرف شجاعت کی ماں، دوسری طرف اس کا باپ بیٹھ گیا، باتوں کا سلسلہ چل پڑا، شجاعت کی ماں اور باپ دونوں نے شفقت سے کہا۔

”بیٹا! یہ تیرا اپنا گھر ہے، ہمیں غیر نہ سمجھنا، تو ہمارے لیے شجاعت کی طرح ہے۔“ شجاعت کی ماں اور باپ کی شفقت دیکھ کر میری آنکھیں نم ہو گئیں، کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ اٹھ کر اندر چلے گئے۔ میں اور شجاعت دوبارہ باتیں کرنے لگے، پھر شجاعت چائے کے برتن اٹھا کر اندر چلا گیا، میں دوبارہ بیڈ پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر کے بعد شجاعت کھانا لے آیا، اس نے کھانے کی ٹرے میز پر رکھی..... ہم دونوں نے مل کر کھانا کھایا، کھانا کھانے کے بعد میں بیڈ پر لیٹ گیا، لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی۔ جب میں اٹھا تو مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں، بیٹھک میں روشنی تھی، شجاعت نے بلب جلا دیا تھا، وہ خود بیٹھک میں نہیں تھا، میں بیڈ پر اٹھ بیٹھا، اندازاً پندرہ بیس منٹ کے بعد شجاعت بیٹھک میں آیا، مجھے دیکھ کر مسکرایا، ساتھ بولا۔ ”خوب سوئے جناب، اب دوبارہ کھانا کھانے کا وقت ہو چکا ہے، کھانا تیار ہے، تمہارے جاگنے کا انتظار ہو رہا تھا، میں ابھی لایا۔“

شجاعت کھانا لینے اندر چلا گیا، میں جلتے بلب کو دیکھنے لگا، مجھے ثمرین شدت سے یاد آ رہی تھی، میں اس کے خیالوں میں کھویا ہوا تھا..... شجاعت کھانا لے کر آ گیا، اس نے میرے خیالات کا تسلسل توڑا، ہم دونوں مل کر کھانا کھانے لگے۔ کھانا کھانے کے بعد شجاعت برتن اٹھا کر پھر اندر چلا گیا۔ چائے پینے کے بعد میں نے رضائی اوڑھی، کافی سردی محسوس ہو رہی تھی، شجاعت بھی چارپائی پر لیٹ چکا تھا، ہمارے چہرے رضائی سے باہر تھے۔ پہلے شاید اسے یاد نہ رہا، اب وہ سگریٹ سلگا چکا تھا، وہ اپنے خطوں میں سگریٹ کا اکثر ذکر کرتا تھا، سگریٹ پیتے ہوئے اس نے اپنا چہرہ میری طرف کر لیا، وہ مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا، پہلے اس نے مجھ سے پوچھا، میں نے اسے اپنے متعلق سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔ میں نے شجاعت کو موجودہ صورت حال سے آگاہ کر دیا، شجاعت چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا، اس نے نئی سگریٹ سلاگلی، سگریٹ سلاگنے کے بعد جوش سے بولا۔

”ہم شمرین کو اٹھا لائیں گے۔“ مجھے ہنسی آگئی، میں ہنستے ہوئے گویا ہوا۔

”اسے اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی، وہ میرے ایک خط پر یہاں آسکتی ہے“ اصل مسئلہ غم روزگار ہے..... میرا اپنا گھر نہیں ہے، اسے یہاں لانا کوئی مسئلہ نہیں..... تم ایسے ہی جوش میں آ رہے ہو، ایسے کاموں میں ہوش سے کام لیا جاتا ہے، تم مجھ سے بڑے ہو، پر شاید میرے جیسے حالات سے نہ گزر رہے ہو گے۔ میں تمہارے پاس اس لیے آیا ہوں کہ مجھے یہاں کوئی کام دلوا دو، مجھے مناسب نوکری مل گئی پھر اسے لانے کا سوچیں گے، کرائے پر مکان لے لیں گے۔ فیصل آباد میں مجھے کام مل جائے پھر میں جا کر شمرین کو لے آؤں گا..... میں یہاں تم پر بوجھ بنے نہیں آیا۔“

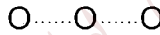
شجاعت نے مجھے ٹوکا اور جذباتی لہجے میں بولا۔ ”سانول! بوجھ والی بات کر کے مجھے شرمندہ کر دیا ہے..... ایسا کبھی نہ سوچنا، ہم غریب ضرور ہیں پر تمہارے لیے جان بھی حاضر ہے۔“ میں بولا۔

”شجاعت! تم نے صرف لاڈ پیار دیکھا ہے، اس لیے ایسی جذباتی باتیں کر رہے ہو، مجھے زندگی کے تجربات نے کافی کچھ سکھایا ہے، ہمیں ہوش سے سوچنا ہے، یہ میری اور شمرین کی زندگی کا مسئلہ ہے۔ میں اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔

شجاعت سگریٹ کا ایک بڑا کش لے کر بولا۔ ”یہاں تمہیں کسی قسم کی کوئی تنگی نہیں ہوگی..... میرے ماں باپ میری طرح تمہارا بھی خیال رکھیں گے، تم ٹھیک کہتے ہو، ہمیں ہوش سے سوچنا ہوگا، فیصل آباد میں میرے ایک دو دوست ہیں، ہم ان سے ملیں گے، نوکری تلاش کریں گے۔“

شجاعت چپ ہوا تو میں نے موضوع بدل دیا، میں اس کی زندگی کی طرف آ گیا، شجاعت دوبارہ چارپائی پر لیٹ گیا، وہ مجھے اپنی زندگی کی کہانی سنانے لگا، اس کی زندگی کی کہانی میں کافی نشیب و فراز اور دکھ کی علامتیں تھیں، میں چہیت کو دیکھتے ہوئے اسے

سنتا رہا۔ رات کے پچھلے پہر کی سرد ہوا بیٹھک کے دروازے کی درزوں سے اندر آنے لگی تھی، وہ اپنی زندگی کی کہانی سنائے جا رہا تھا۔ اس کی زندگی کی کہانی میرے ذہن کی تجوری میں جمع ہوتی جا رہی تھی، جب اس کی کہانی مکمل ہوئی، میں نے اس کی طرف دیکھا..... اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ شجاعت ناکام محبت کو سینے سے لگائے جی رہا تھا، محبت میں بُری طرح ناکام ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آنسو مجھے دکھ کی کیفیت میں مبتلا کر رہے تھے، میرے چہرے پر یاسیت آچکی تھی، میں شجاعت کی ناکام محبت پر اُداس تھا۔ میں اس کے زخموں کو مندمل نہیں کر سکتا تھا، پر اس کے زخموں پر خلوص کا پھایا تو رکھ سکتا تھا، میں اسے دلا سے دیتا اور اس سے باتیں کرتے کرتے سو گیا۔ حالانکہ میں دن کو بھی کافی وقت سویا تھا اس کے باوجود شجاعت سے پہلے مجھے نیند آگئی تھی.....



میں شجاعت کے پاس صرف رہنے نہیں کچھ کرنے آیا تھا، شجاعت گھر میں لاڈلا تھا، کوئی کام نہ کرتا۔ فصلوں کی بیجائی کٹائی کی تمام ذمہ داری اس کے باپ کے ذمے تھی..... شجاعت جتنے پیسے مانگتا اسے گھر سے مل جاتے، کافی آرام پرست ہو چکا تھا۔ میں نے شجاعت کے ہاں آتے ہی ثمرین کو ارم کے ایڈریس پر خط لکھ دیا، دس دنوں کے بعد مجھے ثمرین کا خط مل گیا، اب چوتھے پانچویں دن ثمرین کا خط آنے لگا۔ جس دن ثمرین کا خط ملتا، آنے والی رات میں اس کا جواب لکھ دیتا..... ثمرین خطوں میں کافی کچھ لکھتی، میں شجاعت کو کچھ نہ بتاتا۔ میں نے آتے ہی اسے سب بتا دیا تھا، اسے خود سوچنا چاہیے تھا، مجھے شجاعت دوبار فیصل آباد لے گیا، اپنے کچھ دوستوں سے ملوایا، اس کے دوست بھی اس جیسے ہی تھے۔ انہوں نے دلا سے اور تسلیاں دیں پر مجھے نوکری نہ دلوا سکے۔ تین چار بار کہنے کے بعد میں نے شجاعت کو نوکری کا کہنا چھوڑ دیا، شجاعت

میری ذات پر سوچتا تھا، پر اس سے کچھ ہونہیں رہا تھا۔

میں نے حالات کو وقت کے دھارے پر چھوڑ دیا، ایک ماہ کا عرصہ گزر گیا، شجاعت سے کچھ نہ ہوسکا، وہ مجھے اتنے بڑے شہر میں پرائیویٹ نوکری بھی نہ دلوا سکا، وہ مجھے کچھ کچھ فراموش کرنے لگا تھا، میں تو اشارے کا منتظر تھا، اس نے اپنے رویے سے ظاہر نہ ہونے دیا، میں اس کے ہاں مستقل رہنے نہ آیا تھا، اس نے بار بار اصرار کر کے مجھے بلایا تھا، پر میرے لیے کچھ نہیں کر پا رہا تھا، پھر میں نے ثمرین کو خط لکھ دیا کہ میں واپس آ رہا ہوں، پانچ دنوں کے بعد عید تھی، میں شجاعت کے پاس ڈیڑھ ماہ رہا، وہ ڈیڑھ ماہ میں میرے لیے کچھ نہ کر سکا۔ اس نے مجھے بوجھ نہ سمجھا، پر میں خود پر بوجھ محسوس کر رہا تھا، پھر میں نے اسے اپنی واپسی کا عندیہ دے دیا، وہ کچھ اُداس ہو گیا۔ اس نے مجھے کافی روکنا چاہا لیکن اب میں کہاں رکنے والا تھا، صبح کا وقت تھا، ابھی سورج نہیں نکلا تھا، میں نے اپنا تمام سامان بیگ میں ڈال دیا۔ اس وقت اس کے گھر والے سوئے ہوئے تھے، صرف شجاعت جاگ رہا تھا۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہو چکا تھا، میں نے شجاعت کو اٹھنے کا کہا، شجاعت رضائی سے باہر نکل آیا، میں بیگ اٹھا کر بیٹھک سے باہر آ گیا۔

میرے پیچھے شجاعت بھی باہر آ گیا، وہ میرے ساتھ چلنے لگا، اس کا سر جھکا ہوا تھا، وہ چپ تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ پشیمان ہے، ڈیڑھ ماہ میں میرے لیے کچھ نہ کر سکا تھا، گاؤں کی گلیوں سے ہوتے ہوئے ہم گاؤں سے باہر آ گئے اور بس اسٹاپ پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ کچھ وقت کے بعد بس آ گئی، میں شجاعت سے جلدی جلدی ملا۔ ملنے کے بعد الوداعی نظر اس پر ڈالی، شجاعت کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ بس سرکنے لگی، میں جلدی سے اس میں داخل ہو گیا، بس کی رفتار تیز ہونے لگی، میں نے بس کے دروازے سے پیچھے مڑ کر دیکھا، شجاعت بس کی طرف دیکھ رہا تھا، بس اس سے دُور ہوتی جا رہی تھی، آخر شجاعت نظروں سے اوجھل ہو گیا، میں بس کے دروازے کو چھوڑ کر اندر ایک خالی

سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بیٹھنے کے بعد کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا، سورج نکل آیا تھا، فصلوں کے اوپر دُور دُور تک دُھند تھی، سورج کی روشنی میں دھند کچھ زیادہ ہی دودھیا نظر آرہی تھی، میری آنکھیں دھندلانے لگیں۔ شجاعت میرے اندر کی مضطرب حالت سے بے خبر رہا تھا..... جب آنسو آنکھوں سے باہر آنے لگے تو میں نے سر اگلی سیٹ کی پشت کے ساتھ لگا لیا۔

جب بس فیصل آباد کے اڈے پر آ کر رکی تب میں نے اگلی سیٹ کی پشت سے سر اٹھایا، اس بس سے اترنے کے بعد میں دوسری بس میں آ کر بیٹھ گیا جو میرے شہر جارہی تھی، میری جیب میں واپسی کے کرائے کے علاوہ کچھ اضافی پیسے بھی تھے، شجاعت نے کافی بار مجھے خرچے کے لیے پیسے دینے چاہے پر میں نے انکار کر دیا، آتے وقت بھی اس نے مجھے رقم دینی چاہی لیکن میں نے اس کے پیسوں والا ہاتھ جھٹک دیا۔ بس میں بیٹھنے تک شجاعت خاموش اور پشیمانی کی حالت میں میرے پاس کھڑا رہا..... کچھ دیر بس میں بیٹھنے کے بعد میں نیچے اُترا، بیگ سیٹ کے نیچے رکھ دیا تھا، ابھی بس کے چلنے میں کچھ دیر تھی، میں اڈے پر ادھر ادھر مہلنے لگا، بس کے باہر میرا جی گھبرانے لگا، جہاں سے دوسرے مسافر ٹکٹ لے رہے تھے، میں نے بھی ٹکٹ لیا اور واپس آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا، میرا دل کافی اُداس تھا۔ سوچتے ہوئے میری آنکھیں بار بار بھیگ رہی تھیں، میں نے اگلی سیٹ کی پشت کے ساتھ سر لگا کر آنکھیں بند کر لیں، بس چل پڑی، بس کو چلے جب آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تب میں نے اگلی سیٹ کی پشت سے سر اٹھایا، بس فیصل آباد کو پیچھے چھوڑ آئی تھی، اب سڑک کے دونوں اطراف گاؤں اور فصلیں تھیں۔ میں کھڑکی سے باہر فصلوں اور درختوں کو پیچھے بھاگتے دیکھ رہا تھا، بس تیز رفتاری سے آگے بھاگی جارہی تھی۔

دن کے تین بجے میں اپنے شہر اُترا، بس سے باہر آیا تو سردی محسوس ہونے لگی،

بیگ کندھے سے لٹکائے اپنے گھر کی جانب جانے والی سڑک پر چل پڑا میں اس سڑک پر چلتا ہوا گاؤں پہنچ گیا، رستے میں ملنے والے گاؤں کے لوگ مجھ سے بغلیں ہو رہے تھے۔ مجھ سے کافی سوال کر رہے تھے اور میں ان سوالوں کے ادھورے جواب دے رہا تھا۔ قبرستان کے ساتھ بنی سڑک پر چلتا ہوا ثمرین کے گھر کے سامنے آ گیا، میں نے ثمرین کے گھر کے باہر والے دروازے کی طرف دیکھا، دروازہ بند تھا، میں سر جھکائے چلتا ہوا اپنے گھر کے دروازے پر آ کر ایک لمحے کو رُکا پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا، گھر کے صحن میں چولہے کے پاس ماں بیٹھی ہانڈی پکا رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا تو جلدی سے اٹھی، میں اس کے قریب پہنچ چکا تھا، اس نے مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا اور میرا چہرہ چومنے لگی، چومتے ہوئے وہ رو بھی رہی تھی..... میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے..... ماں مجھے خود سے جدا ہی نہیں کر رہی تھی..... میں روتے ہوئے ماں کی بانہوں سے لٹکا، آنسو پونچھتے ہوئے کمرے کے اندر آ گیا۔ ماں باہر چولہے کے قریب بیٹھ گئی..... میں نے بیگ کندھے سے اتار کر چارپائی پر پھینکا..... جوتے اتارنے کے بعد چارپائی پر لیٹ گیا، شام کے وقت سے ہی سردی محسوس ہو رہی تھی، میں نے رضائی اوڑھ لی، آنکھیں بند کرتے ہی میں نیند کی گہری وادیوں میں گم ہو گیا۔



رات کے وقت ماں نے مجھے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ میرا اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا..... مجبوراً اٹھا، ماں میرے لیے رات کا کھانا لے کر آئی تھی۔ میں اٹھا، اس نے میرے آگے کھانا رکھا، خود دوسری چارپائی پر بیٹھ گئی، میں کھانا کھانے لگا، ماں مجھ سے کافی کچھ پوچھ رہی تھی..... میں کھانا کھاتے ہوئے ہوں، ہاں میں جواب دے رہا تھا۔

اگلے دن کچھ دیر سے اٹھا، صبح کا ناشتا کرنے کے بعد گھر سے باہر آ گیا اور قبرستان میں آ کر، وان کے درخت کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ میں ثمرین کی ایک جھلک

دیکھنا چاہتا تھا کیونکہ تین دن کے بعد عید تھی، میں اسے دیکھنا ہی نہیں، عید سے پہلے اس سے ملنا بھی چاہتا تھا۔ وان کی اوٹ میں بیٹھا شمرین کے گھر کی طرف دیکھے جا رہا تھا، میں اس لیے اس کے گھر کی طرف دیکھے جا رہا تھا کہ شاید آج وہ کالج نہ گئی ہو، گھر میں ہی ہو۔ تقریباً ایک گھنٹہ ان کے گھر کے دروازے کی طرف دیکھتا رہا، ایک گھنٹے کے بعد وہ اپنے گھر سے نکلتی دکھائی دی، سامنے قبرستان تھا، قدرتی طور پر اسے قبرستان کی طرف دیکھنا تھا، میں وان کی اوٹ سے نکل آیا تاکہ وہ مجھے دیکھ لے، اس کی نظر مجھ پر پڑی تو اس کے قدم رُک گئے، رُکنے کے بعد اٹھنے لگے، وہ اپنی بڑی بہن کے گھر کی طرف چل دی..... میں قبرستان کے اوپر سے ہوتا ہوا اس سڑک پر آ گیا جو شمرین اور میرے گھر کے آگے سے گزرتی تھی، اس سڑک پر میرے قدم آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے، شمرین اپنی بہن کے گھر سے نکلی، مجھے دیکھ کر مسکرائی۔

جب میرے قریب آ کر پاس سے گزرنے لگی تو میں نے اسے ملاقات کا وقت بتادیا، اس نے اقرار میں سر ہلایا اور میرے پاس سے گزر کر اپنے گھر چلی گئی۔ میں نے پیچھے مڑ کر جب اس کے گھر کی طرف دیکھا، وہ اپنے گھر کے باہر والے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی۔ اس نے جب مجھے مڑ کر دیکھتے ہوئے دیکھا تو ہاتھ ہلایا، ہاتھ ہلانے کے بعد گھر کے اندر چلی گئی، میں اپنے گھر آ گیا، ہماری ملاقات کا وقت مقرر ہو چکا تھا، ہم نے فجر کی اذان سے اندازاً آدھا گھنٹہ پہلے ملنا تھا، اب تمام رات مجھے جاگ کر گزارنی تھی..... دن کے بعد جب رات آئی میں اپنے کمرے میں دروازہ بند کر کے چادر اوڑھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا، شمرین کو تفصیل سے ایک خط لکھا، خط لکھنے کے بعد وہ رسالے پڑھنے لگا، جن میں میں لکھ رہا تھا، جن میں میری کہانیاں شائع ہونے لگی تھیں..... رسالے پڑھنے کے دوران سوچ بھی رہا تھا کہ اتنے دنوں کے بعد شمرین سے ملوں گا، اس سے کیا کیا باتیں کروں گا، پتہ نہیں کیسی کیسی باتیں ہوں گی؟ رسالے پڑھنے

کے دوران میرا ذہن شمرین کی طرف تھا، اس کا خیال گرم چادر کی طرح مجھے اوڑھے ہوئے تھا، جب رات کے چار بجے تو میں چارپائی سے اٹھا، کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا، جب میں گھر سے باہر آ گیا تو بخ ہوا میرے وجود سے ٹکرائی..... میں چادر صحیح طرح سے اوڑھ کر قبرستان کے اوپر سے ہوتا ہوا کھجور کے پیڑ کے نیچے آ گیا، قبرستان میں اسرار زدہ سناٹا تھا، چار سو ہو کا عالم تھا۔ وان اور کھجور کے پیڑ سہمے ہوئے تھے میری آنکھیں اس پگڈنڈی پر ٹھہری ہوئی تھیں جس پر چل کر شمرین کو آنا تھا۔ میرا جسم سردی سے کپکپانے لگا تھا، چادر نیچے بچھا دی، سردی تو لگنی ہی تھی۔

کچھ وقت کے بعد پگڈنڈی پر ایک ہیولا آتا دکھائی دیا، ہیولا دھند کی دیوار کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ میں اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے چند قدم دور رک کر مجھے پکارا..... میں نے جواب میں کہا، آگے آ جاؤ، شمرین تیز قدموں کے ساتھ میرے قریب آ گئی، آتے ہی مجھ سے لپٹ گئی، اس کی پیٹھ پر میرے دونوں ہاتھ آپس میں مل گئے..... شمرین کچھ سے میری ہانہوں میں رہی۔ ہانہوں سے رہائی دینے کے بعد اس کے چہرے کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، میں نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے اس کے آنسو پونچھے اور اسے پکڑ کر چادر کے قریب لے آیا، اسے بیٹھنے کو کہا، شمرین جوتی اتار کر چادر پر بیٹھ گئی، میں جوتی اتار کر اس کے سامنے بیٹھ گیا..... اس کا چہرا میری آنکھوں کے سامنے تھا، ہم دنوں چپ تھے، چپ بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے، میں نے اسے اپنے قریب کیا، اس کی دونوں آنکھوں کو باری باری چوما، جب میں اس کی بھینکی آنکھیں چوم چکا تب اس نے خاموشی کے ماحول کو اپنی آواز سے پاش کیا اور مجھ سے باتیں کرنے لگی..... میں مسکراتے ہوئے اس سے باتیں کرنے لگا، میں نے اس ملاقات پر بھی پوچھا کہ مجھ سے شادی کرو گی؟ اس نے شرماتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا، ساتھ بولی ”ہاں ہاں ہاں“ میں نے اپنی جیب سے اسے خط نکال کر

دیا اس نے اپنی مٹھی میں دبایا ہوا خط مجھے دیا۔ میں نے اس کا خط جیب میں ڈال لیا اس کی پیشانی چومتے ہوئے اسے عید کی مبارک باد دی، عید کی مبارک باد پر شمرین کھل کھلا کر ہنسی..... اس نے پہلے میرے ہاتھوں کو چوما، پھر پیشانی کو اور پھر آنکھوں کو: اس کے بعد بولی عید کے دن خوش خوش رہنا، اب میں چلتی ہوں، کافی دیر ہو چکی ہے۔ وہ کھڑی ہوگئی، ساتھ میں بھی اٹھا۔ جانے سے پہلے اس نے باری باری میری دونوں آنکھوں کو دوبارہ چوما..... جوتا پہننے کے بعد چل پڑی، تین چار قدم اٹھانے کے بعد وہ رک گئی، واپس مڑی، میں سمجھ گیا کہ وہ واپس مڑ کر کیوں آئی ہے؟ جب وہ قریب آئی میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور چہرے کو جھکا لیا۔ اس نے باری باری میری دونوں آنکھوں کو چوما، واپس مڑی اور دھند میں غائب ہوگئی۔ میں نے جوتا پہنا، نیچے بکھی چادر اٹھائی، اسے جھاڑا اور اوپر کر لی، چل پڑا اور قبرستان کے اوپر سے ہوتا ہوا اپنے گھر آگیا۔ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا، بلب جلایا، چار پائی پر بچھے بستر پر بیٹھ گیا۔ جیب سے شمرین کا خط نکالا، اسے ایک بار پڑھنے کے بعد دوسری بار پڑھا، پڑھنے کے بعد کچھ دیر جلتے بلب کو دیکھ کر سوچتا رہا، پھر اٹھا، بلب بجھایا اور دوبارہ بستر میں آ کر گھس گیا، کچھ دیر شمرین کے خیال نے مجھے سونے نہ دیا پھر آخر مجھے نیند آ گئی.....

○.....○.....○

اگلے دن میں کافی دیر سے اٹھا، ناشتا کرنے کے بعد گھر سے باہر آ گیا، شمرین کے گھر کے آگے سے گزرا تو وہ مجھے دروازے پر نظر آ گئی۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی، اس نے نئے کپڑے پہنے ہوئے تھے، کافی خوبصورت لگ رہی تھی، اس نے ہاتھ ہلایا، ہاتھ ہلانے کے بعد مسکراتی ہوئی اندر چلی گئی۔ میں شہر کی طرف چل پڑا، اس دن میں خوش تھا، تمام دوستوں سے ملا، سارا دن شمرین کا خیال میرے ساتھ رہا، ملاقاتوں کا سلسلہ پھر چل پڑا، ایک ماہ میں تین بار ضرور ملتے..... میں ملاقات والی رات قبرستان میں آ کر ملاقات والی

جگہ پر چادر بچھا دیتا، اس کے اوپر بیٹھ کر پگڈنڈی کی طرف دیکھنے لگتا، پگڈنڈی پر تب تک میری آنکھیں سجدہ ریز رہتیں جب تک ثمرین آنہ جاتی، قبرستان کے تمام درخت میرے دوست بن چکے تھے اب ان درختوں کی طرف دیکھ کر مجھے خوف نہ آتا تھا، کبھی ایسا بھی ہو جاتا، میں قبرستان میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے آ جاتا، اس رات میں قبرستان میں چل پھر لیتا، درختوں کی ٹہنیوں کو چھوتا، تمام درختوں اور قبروں سے میں آشنا ہو چکا تھا، اب رات کے وقت قبرستان میں جاتے ہوئے مجھے ڈرنہ لگتا تھا، ملاقاتوں کا سلسلہ خیر و عافیت سے چلتا رہا، گاؤں کے ہر گھر میں ہمارا تذکرہ تھا، اس کے باوجود ہماری رات کے وقت ملاقاتیں ہو رہی تھیں، ثمرین کے تمام گھر والے مجھ سے شدید نفرت کرنے لگے تھے، میں ان کی نفرت کو خاص اہمیت نہ دیتا تھا، میں صرف ثمرین کو دیکھتا تھا، ثمرین کے علاوہ مجھے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ میں ثمرین کی محبت کے کولہو پر نیل کی طرح جت چکا تھا، میری آنکھوں پر ثمرین کی محبت نے کھوپے چڑھا دیے تھے، میں نیل کی طرح محبت کے اس کولہو پر گیڑے لگا رہا تھا، یہی گیڑے میری دنیا تھی، اس کے علاوہ دنیا میں کیا ہو رہا تھا، مجھے کچھ علم نہ تھا.....



تین چار ماہ کے بعد میرے سوتیلے باپ قدیر کے کسی نے کان بھر دیے، اس نے ماں کو واضح لفظوں میں کہہ دیا کہ اسے یہاں سے کہیں بھیج دو، مجھے اب یہ یہاں نظر نہ آئے۔ ماں نے مجھے سمجھایا کہ ثمرین کا خیال دل سے نکال دو، میں نے جواب میں ماں سے کہا، میرے وجود سے جان نکلی سکتی ہے پر دل سے ثمرین کا خیال اور پیار نہیں۔ ماں نے قدیر کا آرڈر سنا دیا، میں نے جواب میں کافی باتیں کیں، میری تمام باتیں بے سود تھیں۔ ماں نے کراچی سے بڑے بھائی کبیر کو بلوایا، وہ مجھے لے جانے کے لیے آیا تھا، جانے سے ایک رات پہلے میں رات کے پچھلے پہر ثمرین سے ملا، اس ملاقات پر میں نے

ثمرین کو سب بتادیا، ثمرین کافی اُداس ہو گئی، اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اس کی آنکھوں کے آنسو پونچھتے ہوئے میں نے اسے دلا سے تسلیاں دیں کہ میں جلدی واپس آ جاؤں گا، جاتے ہی خط لکھوں گا، اس میں وہاں کا کوئی محفوظ ایڈریس لکھ دوں گا، میرا خط ملتے ہی تم مجھے خط لکھنا، ارم کو سمجھا دینا، میرا خط تمہاری علاوہ کسی اور کے ہاتھ نہ لگے، اس رات ثمرین کی آنکھوں میں آنسوؤں کے علاوہ دکھ کا پرتو بھی تھا۔

میں نے اس رات ثمرین کی آنکھوں کو بار بار چوما، جب میں نے اسے جانے کا کہا، ثمرین انھی چند قدم اٹھانے کے بعد واپس مڑ کر آئی، میری دونوں آنکھوں کو باری باری چوما، پھر چل دی، چند قدم چلنے کے بعد پھر واپس مڑ کر آئی، میری دونوں آنکھوں کو دوبارہ چوما..... اس کے بعد وہ نہ رکی اس کے قدم پگڈنڈی پر اٹھنے لگے، میں کھجور کے نیچے کھڑا ہو کر اسے جاتا دیکھ رہا تھا، پھر وہ اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ میں چادر اٹھا کر اپنے گھر آ گیا۔

اگلے دن میں بھائی کیر کے ساتھ کراچی چل دیا، بھائی کے ساتھ چلتے ہوئے میں غمزہ تھا، تمام رستے افسردہ رہا، کراچی بھائی کے گھر پہنچنے کے بعد میں بیٹھک کا ہو کر رہ گیا، میں اندر صحن میں اور بھائیوں کے کمروں میں بہت کم جاتا، بیٹھک کا اندرونی دروازہ زیادہ بند رکھتا، صبح بیٹھک میں ناشتا کرنے کے بعد آوارہ گردی کرنے نکل جاتا اور سارا دن کراچی کی گلیوں، بازاروں، سڑکوں پر منگشت کرتا..... ثمرین کا خیال سائے کی طرح میرے ساتھ ساتھ ہوتا..... بھائی کے گھر کے قریب جو دکاندار تھا اس سے میری سلام دعا ہو گئی۔ میں نے خود اس سے تعلق پیدا کیا، صرف ثمرین کے خط کے لیے..... میں نے ثمرین کو خط لکھ کر اس دکاندار کا ایڈریس دے دیا، گیارہ بارہ دنوں کے بعد ثمرین کا خط آ گیا، ثمرین کا خط پڑھ کر مجھ میں ایک نیا جوش پیدا ہو گیا، میں کراچی میں کچھ کرنے کا سوچنے لگا۔ انہی دنوں میں کچھ بیمار ہو گیا، ایسا بیمار ہوا کہ جلدی ٹھیک

ہونے میں ناکام رہا، میری صحت گر گئی، مجھے بخار ہوا تھا، جو ٹائیفائیڈ کی صورت اختیار کر گیا۔ بھائی میرا علاج کر رہے تھے، دوائیاں کھانے کے باوجود میں ٹھیک نہ ہو رہا تھا، دونوں بھائی میرے یوں بیمار ہونے پر کافی پریشان تھے۔ بدل بدل کر ڈاکٹروں کے نسخے استعمال ہو رہے تھے، پھر ایک ڈاکٹر کی دوائیوں سے میں ٹھیک ہونے لگا، چلنے پھرنے لگا تھا..... میں رات کو دیر سے سوتا، اس لیے صبح دیر سے اٹھتا..... دن کے دس بجے کے بعد میں جاگ جاتا، اس رات بھی میں دو ڈھائی بجے سویا، صبح بھائیوں نے مجھے جھنجھوڑ کر اٹھایا، دونوں بھائی پریشان تھے، انہوں نے پریشانی کی حالت میں مجھے بتایا، گھر سے فون آیا ہے، ابھی ابھی دکاندار بتا کر گیا ہے، ہمارا سوتیلا باپ قدیر فوت ہو گیا ہے، ہمیں گھر فوری پہنچنا ہے، میں نے ان کے سوگوار چہروں کو دیکھ کر جواب دیا ”تم چلے جاؤ، میں نہیں جاؤں گا۔“

بڑے بھائی کبیر نے غمزہ لہجے میں کہا ”کا کا! ہمارا باپ فوت ہو گیا ہے۔“
 ”پھر میں کیا کروں؟ آپ دونوں چلے جاؤ، میں نہیں جاؤں گا۔“ میں اتنا کہہ کر اپنے اوپر دوبارہ چادر لپیٹ کر سو گیا، دونوں بھائی بیٹھک سے اندر چلے گئے..... میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، میں اُس شخص کی موت پر رو رہا تھا، جس نے ہمیشہ میری بے عزتی کی، اذیت سے دوچار کیا..... مجھے ماں کا چہرہ نظر آ رہا تھا، ماں کی آنکھوں سے بہتے آنسو نظر آ رہے تھے، ماں دوسری بار بیوہ ہو چکی تھی..... میں چادر اوپر کیے بیٹھک میں پڑا رہا، بڑا بھائی کبیر جانے سے پہلے اتنا کہہ گیا کہ ہم سب جا رہے ہیں، گھر کا خیال رکھنا۔ بھائی اتنا کہہ کر چلا گیا، میں نے اپنے اوپر سے چادر نہ اتاری..... جب بھائی چلے گئے تو میں چادر اُتار کر اٹھا..... اندر صحن میں آیا، صحن والا دروازہ اندر سے بند کیا، دوبارہ بیٹھک میں آ کر کرسی پر بیٹھ کر شمرین کو خط لکھنے لگا۔

دس دنوں کے بعد بھائی واپس کراچی آ گئے، بھائیوں اور بھابیوں کے ساتھ ماں بھی تھی، دستک کے بعد جب میں نے باہر والا دروازہ کھولا، سامنے بھائی بھابیاں بچے اور ماں کھڑی تھی، ماں نے مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا، ماں رونے لگی تھی، بھائی ماں کو چپ کر رہے تھے۔ ماں مجھے چھوڑ نہیں رہی تھی، میری آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے تھے۔ بھائیوں نے ہم کو جدا کیا، بھائی ماں کو پکڑے اندر کمرے میں لے آئے، اندر کمرے میں، میں ماں کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا، ٹائیفاؤڈ نے مجھے کافی کمزور کر دیا تھا، ماں بار بار میرے اندر کو دھسنے گالوں کو چوم رہی تھی۔ اس نے میرے چہرے کو بار بار چوما، ماں آتے ہی میری تیمارداری میں لگ گئی، ماں کے آنے کے بعد میری صحت اچھی ہوتی گئی۔ ایک ہفتے میں، میں کافی حد تک ٹھیک ہو گیا۔

کافی سوچ بچار کے بعد ماں نے مجھے واپس گھر لے جانے کی ٹھان لی، پھر ایک دن بھائی ہمیں گاڑی میں بٹھا گئے، دو ماہ کراچی میں رہنے کے بعد میں ماں کے ساتھ واپس گھر آ گیا، گھر آ کر میں کسی رشتے دار سے نہ ملا، دوستوں سے صرف سلام دعا ہوئی، دوستوں کو صحیح وقت نہ دے سکا، کراچی سے واپس آتے ہوئے تمام راستے میں یہی سوچتا آیا کہ اب کہیں نہیں جاؤں گا..... یہیں کوئی کام کروں گا، ساتھ پڑھائی بھی جاری رکھوں گا، واپس گھر آتے وقت مجھے بھائیوں نے دس ہزار روپے دیے اور سمجھایا کہ اب تم نے کہیں نہیں جانا، ماں کے ساتھ گھر میں رہنا ہے، ان پیسوں سے کوئی کام کر سکو تو کر لینا، نہیں تو ہم بھیجتے رہیں گے۔ میں نے ان پیسوں سے شہر میں چھوٹی سی کتابوں کی دکان بنانے کا سوچا، پھر میں نے اپنی اس سوچ کو عملی جامہ پہنا دیا، شہر میں دکان کرائے پر لے کر اس میں بک ڈپو کا سامان رکھ لیا، اب میں تمام دن بک ڈپو پر ہوتا۔ کام گزارے لائق تھا، اب میرا یہاں رہنے کا جواز پیدا ہو چکا تھا، ویسے بھی مجھے گھر سے نکالنے والا خود قبر میں جاسویا تھا۔ ثمرین سے رات کے وقت ملاقاتیں ہو رہی تھیں،

ثمرین کی محبت میں کسی قسم کی کمی نہ آئی تھی، ثمرین ہر ملاقات پر مجھے وارفتگی سے ملتی، پہلے کی طرح خط لکھتی، اس کی ملاقاتوں اور خطوں نے مجھ میں ایک نیا عزم پیدا کر دیا تھا۔

پھر میں نے ایف۔ اے کا امتحان دیا، میرے پیپرز اچھے ہوئے، جب نتیجہ نکلا، میں اچھے نمبروں سے پاس ہوا، ثمرین میری اس کامیابی پر بہت خوش تھی، رزلٹ کے بعد جب رات کے وقت ہماری ملاقات ہوئی، وہ مٹھائی لے کر آئی، اس نے اپنے ہاتھوں سے مجھے مٹھائی کھلائی۔ اس ملاقات پر ثمرین مجھ پر نازاں تھی۔ اس نے بار بار مجھے اس کامیابی پر مبارک باد دی، اس ملاقات پر بھی ہمارا آپس میں خطوں کا تبادلہ ہوا، ملاقات کے بعد جب میں نے گھر آ کر اس کا خط پڑھا تو خوشی سے میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ ثمرین میرے پاس ہونے پر بے حد خوش تھی، اس نے خط میں یہ بھی لکھا کہ اب بی۔ اے کی تیاری شروع کر دو، تم نے بی۔ اے بھی کرنا ہے۔ میں نے بی۔ اے کی کتابیں خرید لیں، انہیں پڑھنا شروع کر دیا، بک ڈپو بڑی مشکل سے میری اور ماں کی کفالت کر رہا تھا، میں نے کئی بار سوچا کہ اس کام کو چھوڑ کر کوئی اور کام کروں لیکن کیا کام کرتا؟ میرے پاس سرمایہ نہ تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد آخر اس کام کو ہی ذریعہ معاش بنالیا۔

وقت گزرتا رہا، ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں، اب میں مختلف رسائل و جرائد میں افسانے، کہانیاں لکھنے لگا تھا، جن رسائل میں میری تحریریں شائع ہو رہی تھیں، وہ ملک کے معروف ادبی رسائل تھے، ان رسائل میں میری کافی حوصلہ افزائی ہو رہی تھی، پڑھنے والے میری تحریروں کو بے حد سراہنے لگے تھے، ملک کے تمام بڑے شہروں میں میرے چاہنے والے تھے۔ شجاعت کے بعد میں نے سوچ لیا کہ اب کسی دوست کے پاس نہیں جاؤں گا۔ ثمرین بی۔ اے پاس کر گئی، اب وہ تمام دن گھر میں ہوتی، ہماری رات کے وقت ملاقاتیں ہو رہی تھیں..... بی۔ اے کے بعد ثمرین کے گھر رشتے آنے لگے۔ جو

لوگ رشتے مانگنے آرہے تھے، ثمرین ان سے کافی پریشان تھی، وہ خطوں میں تفصیل سے سب لکھ رہی تھی۔ جب رات کے وقت ہماری ملاقات ہوتی، میں اسے کافی سمجھاتا، اپنے ہر خط میں لکھتا کہ لڑکی والوں کے گھر رشتے آتے ہیں، تم مجھ سے محبت کرتی ہو، رشتے لے کر آنے والے لوگوں کے بارے میں نہیں، میرے بارے میں سوچو۔ میری ان باتوں کے بعد ثمرین کے ایک دو خط حوصلہ افزا آئے، پھر وہی رشتوں، گھر والوں کی پسند ناپسند کی باتیں لکھی ہوتیں، میں ہر ملاقات پر اسے کہتا، ثمرین! میرا دنیا میں تمہارے سوا کوئی نہیں، ثمرین جواب میں کہتی، میں تمہاری ہوں، ہمیشہ تمہاری رہوں گی، میری شادی صرف تم سے ہوگی، میں صرف اور صرف تمہاری دلہن بنوں گی، اپنے ہاتھوں پر تمہارے نام کی مہندی لگاؤں گی۔ ملاقات کے بعد جب میں واپس گھر آ رہا ہوتا تو میرا ذہن مطمئن ہوتا۔ ایک دو ملاقاتوں کے بعد ثمرین پھر وہی اپنے رشتے کی باتیں کرنے لگتی۔ اس کے خطوں میں دکھ دینے والی باتیں لکھی ہوتیں کہ میں لڑکی ہوں، آخر کب تک تمہارا انتظار کر سکتی ہوں؟ لڑکی ماں باپ کے گھر بوجھ لگتی ہے، میں حالات کا مارا ہوا تھا، ابھی پڑھ رہا تھا، بک ڈپوکا کام گزارے لائق تھا..... بی۔ اے کرنے کے بعد مجھے نوکری کی تلاش کرنی تھی..... ایف۔ اے کی سند نہ ہونے کے برابر تھی، رات کے وقت جب ہماری ملاقات ہوتی تب اسے بہت سمجھاتا، اپنے ہر خط میں باور کراتا کہ میرا اس کے سوا کوئی نہیں۔

پھر رات کی ایک ملاقات پر ثمرین رو پڑی۔ اس نے روتے ہوئے بتایا، میرے گھر والے میری جلدی شادی کرنا چاہتے ہیں، تم کچھ کرو، ثمرین میرے سینے کی دیوار سے لگ کر رونے لگی تھی، میں نے اس کا چہرہ اپنے سینے سے اٹھایا، اس کے آنسو پونچھتا ہوا بولا..... تمہارے گھر والے تمہاری شادی کسی اور سے کیسے کر سکتے ہیں، جب تمہاری شادی ہونی ہی مجھ سے ہے، جب تمہیں میری دلہن بننا ہے پھر تمہاری کسی اور سے کیسے

شادی ہو سکتی ہے؟ شمرین اُداسی سے بولی، میرے گھر والے تم سے نفرت کرتے ہیں، وہ تمہیں کبھی رشتہ نہیں دیں گے، میں شمرین کا ہاتھ تھام کر بولا، تمہاری شادی مجھ سے ہونی ہے، صرف مجھ سے، تمہیں صرف میری دُہن بننا ہے۔ شمرین میری ایسی باتوں کے جواب میں مزید رونے لگتی، میں نے اسے بار بار کہا شمرین! تمہیں میری دُہن بننا ہے صرف میری، تم اپنے گھر والوں کے سامنے ڈٹ جاؤ..... تمہارے گھر والے تمہارے لیے جو رشتہ پسند کریں، تم انکار کر دو، میں ہر ملاقات پر اسے یہ ضرور کہتا، میری ان باتوں کے باوجود وہ خطوں میں انہی باتوں کو دہراتی رہتی۔ خطوں میں اس کی باتیں پڑھ کر اُداس ہو جاتا، پھر ایک دن میں نے ماں کو شمرین کے رشتے کا کہہ دیا کہ رشتے کے لیے ان کے گھر جائیں، پہلے پہل تو ماں نے انکار کیا، جب میں نے کہا کہ یہ میری زندگی کا سوال ہے، اگر آپ ان کے گھر نہ گئیں تو میں مر بھی سکتا ہوں، مجھ میں مرنے کا حوصلہ ہے۔ میری دھمکی کام کر گئی، شام کے وقت ماں ان کے گھر چلی گئی، ایک گھنٹے کے بعد سر جھکائے واپس آ گئی، شمرین کے گھر والوں نے رشتہ دینے سے صاف انکار کر دیا، ماں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مجھ سے مزید ماں کے پاس نہ رُکا گیا، میں گھر سے باہر آ گیا، سڑک پر آیا تو بڑ بڑانے لگا، شمرین! تمہارے گھر والوں سے مجھے ایسے برتاؤ کی اُمید نہ تھی۔ وہ ماں کو یہ بھی تو کہہ سکتے تھے کہ ہمیں سوچنے کی مہلت دو، مجھے تمہارے گھر والوں کے اس ناروا سلوک سے دُکھ ہو رہا ہے، آدھی رات تک میں سڑک پر چلتا ہوا بڑا تارہا، پھر گھر آ گیا۔

اس کے بعد ہماری رات کے وقت جب بھی ملاقات ہوئی شمرین کے ہونٹوں پر چپ جبکہ اس کی آنکھوں میں آنسو ہوتے، آنسو بھری آنکھیں مجھ سے چرانے لگتی۔ میرے ہونٹ اس کی آنکھوں کے آنسو پونچھ دیتے..... اب ہماری ملاقاتوں پر شمرین میں وہ پہلے والا والہانہ پن نہ ہوتا، شمرین روتے ہوئے مجھے بتاتی۔

”میرے گھر والے جلد ہی شادی کرنے والے ہیں، انہیں رشتہ پسند آ گیا ہے جس لڑکے سے وہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں، وہ لڑکا مجھے پسند نہیں لیکن میرے گھر والے ہاں کر چکے ہیں، اب میں کیا کروں؟ میں تمہیں کسی صورت نہیں چھوڑ سکتی، مجھے بتاؤ، میں کیا کروں؟ میرے گھر والے میری جلدی شادی کر رہے ہیں۔“

جواب میں، میں مسکرا پڑتا، اسے کچھ نہ کہتا، مجھے جو کہنا تھا پہلے کہہ چکا تھا، جب ثمرین زیادہ رونے لگتی، میں اسے چپ کراتا، اس کے آنسو پونچھتا، اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھاتا اور کہتا، اب جاؤ، کوئی آنہ جائے، ثمرین پہلے کی طرح چند قدم اٹھانے کے بعد واپس مڑ کر آتی، میری آنکھیں چومتی، آنکھیں چوم کر پگڈنڈی پر چل دیتی جاتے ہوئے پیچھے مڑ کر نہ دیکھتی، جب اندھیرے میں غائب ہو جاتی، میں بھیگی آنکھوں کے ساتھ سر جھکائے قبرستان کے اوپر سے ہوتا ہوا گھر آ جاتا.....



ثمرین کے رشتے کی بات طے ہو گئی، ثمرین میں تھوڑا تھوڑا بدلاؤ آ گیا، وہ پہلے کی طرح اپنے گھر کے دروازے پر میرا انتظار نہ کرتی..... سر راہ مل جاتی تو رُک کر میرا حال احوال پوچھتی، جواب میں، میں مسکرا کر کہتا۔

”ٹھیک ہوں۔“ پھر وہ آگے کو چل دیتی، میں سر جھکائے اپنی راہ لیتا، ثمرین سے مل کر ہی نہیں، میں ویسے بھی نیچے دیکھ کر چلنے لگا تھا، میرے قدموں کی چال بدل چکی تھی، میری بڑبڑاہٹ میں اضافہ ہو چکا تھا۔ اس کے بعد رات کے وقت ہماری جتنی ملاقاتیں ہوئیں، ہر ملاقات پر مجھے ایسے لگتا جیسے یہ ہماری آخری ملاقات ہو، میں ہر ملاقات پر غمزدہ اور اُداس ہوتا تھا لیکن ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا..... پھر ایک ملاقات پر اس نے مجھے روتے ہوئے بتایا ”چند دنوں کے بعد میرا نکاح ہونے والا ہے، مجھے معاف کر دو، میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکی، میں مجبور تھی۔“

اس ملاقات پر میں نے سوگوار آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا، آسمان پر پچھلی رات کے ستارے چمک رہے تھے، سامنے کھجور دان کے پیڑ پچھلی رات کے سکوت میں محبت کے اس طرح کے انجام پر خاموش ماتم کناں تھے، ہوانے احتجاجاً چلنا بند کر دیا تھا، قبرستان میں جس اور گھٹن بڑھ گئی تھی، مجھے سانس لینے میں تنگی محسوس ہو رہی تھی، اس ملاقات پر میں نے تسلیم کر لیا کہ ثمرین میری نہیں رہی، کسی اور کی ہو چکی ہے، اس نے اپنی مجبوریوں کا خلاصہ کھول کر میرے سامنے رکھ دیا تھا، میں نے اس پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ قصور وار ہے، میں اس کے بچاؤ میں لگ گیا، اسے اچھے طریقے سے وداع کرنا چاہتا تھا، اسے یہ باور نہیں کرانا چاہتا تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر جا رہی ہے، اس ملاقات پر میں نے ہاتھوں سے اسے پیچھے ہٹا کر کہا، بس تم جاؤ، کوئی آ سکتا ہے، ثمرین روتی ہوئی چل دی، میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا، جب وہ اندھیرے میں غائب ہو گئی، تب میں شکستہ قدموں اور جھکے سر کے ساتھ گھر آ گیا۔



کچھ دنوں کے بعد ثمرین کا خط ملا، ثمرین نے بک ڈپو والے پتے پر خط لکھا تھا، اس نے خط میں لکھا، میں تم سے ملنا چاہتی ہوں، کسی محفوظ ٹھکانے پر جس طرح بھی ہو سکے مجھے ملو، اس نے خط میں تاریخ اور وقت لکھ دیا، اسکول کا نام بھی لکھ دیا۔ جہاں اس کی بی۔ ایڈ کی ورکشاپ شروع تھی، اس اسکول کے گیٹ پر مجھے صبح کے ساڑھے نو بجے پہنچنا تھا، ابھی چار دن باقی تھے، ان چار دنوں میں مجھے محفوظ ٹھکانہ تلاش کرنا تھا۔ پھر میری مشکل آسان ہو گئی، میرے ایک دوست عمیر نے میری مشکل آسان کر دی، اس سے اچھی خاصی دعا سلام تھی، اس کے گھر ہماری ملاقات کا وقت مقرر ہو گیا۔ اس نے اپنی بیوی کو ہمارے متعلق اچھی طرح سمجھا دیا، جس دن ہماری ملاقات تھی، عمیر بینک ڈیوٹی پر تھا، جب میں اور ثمرین ان کے گھر پہنچے، عمیر کی بیوی نے ہماری آؤ بھگت میں کوئی کسر نہ

چھوڑی۔ ان کا گھر دو کمروں پر مشتمل تھا، عمیر کی بیوی نے ایک گول مٹول سا خوبصورت بچہ اٹھایا ہوا تھا، وہ ہمیں ایک کمرے میں لے آئی، کمرہ صاف ستھرا تھا، کمرے کی ہر چیز میں نفاست اور قرینہ تھا، اس نے ہم کو میڈ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم بیڈ پر بیٹھ گئے، وہ ہمیں بٹھا کر دوسرے کمرے میں چلی گئی، ہم دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ گئے، پہلے ایک دوسرے کو محویت سے دیکھتے رہے، پھر باتیں کرنے لگے، ثمرین نے برقع اتار دیا تھا، عمیر کی بیوی ہمارے لیے فروٹ لے آئی، اس نے فروٹ والی ٹرے ہمارے بیچ رکھ دی، ہمیں یوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھا دیکھ کر مسکرائی، ہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے یوں بیٹھے تھے جیسے سہاگ رات میں دُلہا دُلہن بیٹھے ہوتے ہیں۔ ثمرین نے میرا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا، اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی میرے ہاتھوں کی لکیروں پر پھیرنے لگی، حالانکہ ان ابھی لکیروں میں ہمارے ملن کی لکیر نہ تھی، اس کے رشتے کی بات طے ہو چکی تھی، اس کے باوجود میرے ہاتھ کی لکیروں میں اپنے نام کی لکیر تلاش کر رہی تھی۔

”ثمرین!“ میں نے آہستہ سے اسے پکارا، اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا۔

”کیا واقعی تمہاری شادی ہو جائے گی۔“

پھر؟ پھر؟ میں ہنسنے لگا، وہ غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ میں ہنسانے والی باتیں کرنے لگا، وہ واقعی میری باتوں سے ہنسنے لگی تھی، اس ملاقات پر میں شدید دُکھ اور کرب میں تھا، میرے اندر ٹوٹ پھوٹ ہو رہی تھی۔ ثمرین مجھ سے پچھڑنے کا حوصلہ پیدا کر چکی تھی، وہ مجھے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی اور چھوڑ بھی رہی تھی، مجھے یقین ہو چکا تھا کہ ثمرین مجھے چھوڑ جائے گی، میرے وجود میں تھوڑی تھوڑی لرزش ضبط سے آئی تھی، ثمرین سے میں اپنے اندر کا دُکھ چھپا گیا تھا۔ ثمرین کے پچھڑنے کا مجھے اتنا دُکھ

کیوں تھا؟ جب اس میں جدا ہونے کا حوصلہ تھا۔

چار گھنٹے کی اس ملاقات میں، میں نے اپنی باتوں سے اسے بہت ہنسایا، اسے ظاہر نہ ہونے دیا کہ میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ رہا ہوں، چار گھنٹے غمیر کے گھر گزار کر ہم باہر سڑک پر آ گئے، ٹرین میرے ساتھ چلتی ہوئی خوش تھی، میں نے ایک رکشہ رکوا کر اس میں ٹرین کو بٹھا دیا، رکشہ چل دیا، میں پیدل چلنے لگا، میرے قدم شکستگی سے اٹھ رہے تھے، جس رکشہ میں ٹرین تھی، وہ نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔



اب رات کے وقت ہماری ملاقاتیں نہیں ہو رہی تھیں، میں راتوں کو دو اڑھائی بجے تک جا گئے لگا تھا۔ میری خود پر توجہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ نکاح سے کچھ دن پہلے اس نے مجھے خط لکھا، خط میں بار بار تاکید کی کہ بی۔ ایڈ کے فائل لیسن والے دن تم مجھے ضرور ملنے آنا۔ اب میں انکار نہ کر سکتا تھا، وہ کون سی میرے پاس تھی؟ اس نے خط میں اس اسکول کا نام بھی لکھا، جس میں اس کا فائل لیسن ہو رہا تھا۔ میں صبح دس بجے اسکول کے گیٹ پر آ گیا، اس دن میں واقعی اُداس تھا، میں اس سے ملنا نہیں چاہتا تھا، کچھ دنوں کے بعد اس کا نکاح ہونے والا تھا۔ اس نے خط میں بھی لکھ دیا تھا کہ میرا نکاح ہونے والا ہے بی۔ ایڈ کے فائل لیسن کے بعد میرا نکاح ہو جائے گا..... چند دنوں کے بعد اس کا نکاح ہونے والا تھا، اس کے باوجود وہ مجھ سے ملنے پر بضد تھی، میں سوچ سوچ کر مزید اُداس ہو رہا تھا، ڈیڑھ دو گھنٹے اسکول کے گیٹ کے سامنے کھڑا رہنے کے بعد میں اسکول کے گرد چکر لگانے لگا، دن کے تین بجے تک میں اسکول کے گرد چکر لگاتا رہا، ٹرین اسکول سے باہر نہ آئی، جب چار بجے تو میں نے خود سے کہا، اپنی راہ لو، وہ چلی گئی ہوگی، تم صبح کے آئے ہوئے ہو، اسکول کے گرد پرکار کی طرح گھوم رہے ہو، کسی چکر کے دوران وہ اسکول سے نکل گئی ہوگی، چار بجے میں سر جھکائے چل پڑا.....

ایک فرلانگ کے بعد سڑک پر موڑ مڑتا تھا، موڑ مڑنے سے پہلے میں نے پیچھے مڑ کر اسکول کے گیٹ کی طرف دیکھا، میرے قدم رُک گئے، وہ اسکول کے گیٹ سے نکل رہی تھی، اس نے مجھے دیکھ لیا تھا، اس کے ہاتھ میں چارٹ تھا، اس نے چارٹ ہلایا..... میں رُک گیا، وہ چلتی ہوئی میرے قریب آ گئی، حال احوال پوچھنے کے بعد میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ ہم چلتے ہوئے ایک گلی میں آ گئے، میں نے فائل لیسن کے متعلق پوچھا کہ کیسا ہوا ہے، اس نے مسکراتے ہوئے بتایا، اچھا ہوا ہے۔ اس کا بی۔ ایڈ کا کورس مکمل ہو چکا تھا، وہ کورس کے مکمل ہونے پر کافی خوش تھی، اسے تدریسی شعبہ بہت پسند تھا۔ ہم باتیں کرتے ہوئے ساتھ ساتھ چلتے رہے، دو فرلانگ کے بعد گلی ختم ہو گئی، روڈ آ گیا، روڈ پر اکا دکا ٹریفک تھی، وہ میرے ساتھ ساتھ ایسے چل رہی تھی جیسے بیوی اپنے خاوند کے ساتھ چلتی ہے۔ اس دن وہ کافی خوشگوار موڈ میں تھی، اس کے لہجے میں انجانی مسرت تھی، بی۔ ایڈ کا کورس مکمل ہونے کی خوشی تھی کہ مجھ سے ملنے کی خوشی تھی، میں سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی، جواب میں میں بھی ہنس رہا تھا بلکہ زیادہ اسے ہنسا رہا تھا، وہ ہنستی ہوئی میرے ساتھ چل رہی تھی، اس روڈ پر دو فرلانگ چلنے کے بعد نجانے اسے کیا ہوا کہ اس نے ڈرتے ہوئے کہا ”فاصلہ رکھ کر چلو۔“ جب اس نے کہا فاصلہ رکھ کر چلو، میرے قدم رُک گئے، میں نے پاگلوں کی طرح دائیں بائیں دیکھا، روڈ کے دائیں طرف اسکول کا گراؤنڈ جبکہ بائیں طرف ایک مسجد تھی، میں رکنے کے بعد چلنے لگا تھا، ہمارے درمیان چند قدموں کا فاصلہ آ گیا تھا، جس سے اس نے کہا فاصلہ رکھ کر چلو، مجھے ایسا اگا جیسے اس نے کہا ہو ”میں تمہاری نہیں ہوں۔“

اس دن مجھے ٹرین کے پیچھے چلتے ہوئے گھٹن محسوس ہوئی، مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے زمین سے لے کر آسمان تک گھٹن ہی گھٹن ہے، اس دن ہم ایک ہوٹل میں ملے ہوٹل کے کیبن میں وہ میرے سامنے بیٹھی تھی، اس نے چہرے سے نقاب اتار دیا تھا،

کافی فریش نظر آ رہی تھی، مجھ سے ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اس ملاقات پر بھی میں نے اپنی باتوں سے اسے بہت ہنسایا، اس کے نکاح کی کوئی بات نہ کی، جب وہ غمگین ہو کر بتانے لگی تو میں نے موضوع بدل دیا، اس نے کہا ”میرے بعد خوش خوش رہنا۔“ میں نے ہنستے ہوئے پھر موضوع بدل دیا۔ جب اس کی چھوٹی اور گہری آنکھیں میری آنکھوں میں غور سے دیکھنے لگتیں، میں کوئی ہنسانے والی بات کر دیتا، اس ملاقات پر میں نے اسے اُداس نہ ہونے دیا، نہ ظاہر کرایا کہ میں شدید دُکھ اور اذیت میں ہوں، کچھ وقت ہوٹل کے کیمین میں گزارنے کے بعد ہم باہر آ گئے، کھانا ویسے کا ویسا ہی پڑا رہا، ہم دونوں سے کچھ نہ کھایا گیا، میں نے کاؤنٹر پر بل ادا کیا، ہم دونوں ہوٹل سے باہر آ گئے، میں نے ثمرین کو ایک رکشے میں بٹھایا، رکشے والے کو کرایہ دیا، رکشہ چل پڑا، رکشہ دُور ہوتا ہوا آخر نظروں سے اوجھل ہو گیا، میں سر جھکائے روڈ پر چلنے لگا۔



جمعہ کا دن نکاح کا رکھا گیا، اس دن میں صبح کے وقت گھر سے نکل کر چلتا ہوا نہر پر آ گیا۔ نہر پر میں پہلے بھی آتا تھا، جب زیادہ اُداس ہوتا نہر کی پٹری پر دُور تک چلتا، جب چل چل کر تھک جاتا تب واپس مڑتا، اس دن میں صبح کے وقت نہر کی پٹری پر آ گیا اور شام تک نہر کی پٹری پر چلتا رہا۔ شام کے وقت واپس مڑا، آدھی رات کے بعد گھر آیا، میرا جسم تھک کر چُور ہو چکا تھا، گھر آ کر بستر پر لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی۔ اس سے اگلے دن ثمرین مجھے شہر کی ایک تنگ گلی میں ملی، اس دن اس میں ڈر اور خوف تھا، وہ میری نہیں کسی اور کی لگ رہی تھی۔ اس تنگ گلی میں وہ میرے ساتھ چلنے پر مجبور تھی، اس دن وہ مجھے بتانے آئی تھی کہ میرا نکاح ہو چکا ہے، میں کسی اور کی ہو چکی ہوں۔ مجھے ہنسی آ گئی، اس نے تأسف سے مجھے دیکھا، میں ہنستے ہوئے بولا۔ یہ نکاح کیا ہوتا ہے، میں نہیں مانتا، اس نے غمزہ لہجے میں کہا۔ سچ کہہ رہی ہوں، میرا نکاح ہو چکا ہے، میں اب نارمل انسان کی

طرح بڑبڑایا۔ میں نہیں مانتا۔ تمہیں یقین کیوں نہیں آ رہا؟ اتنا کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں، میں ہنستے ہوئے اس کے ساتھ چلتا رہا، تنگ گلی ختم ہو گئی، اس کے قدموں میں تیزی آ گئی، وہ مجھ سے آگے نکل گئی، میں پیچھے رہ گیا۔

اس کے اگلے دن وہ پھر مجھے اس تنگ گلی میں ملی، میرے ساتھ چلنے لگی، اس دن اس میں پہلے سے بھی زیادہ خوف تھا، اس نے ساتھ چلتے ہوئے پرس کی زپ کھولی، اس میں سے ایک کاغذ نکالا، میری طرف کیا اور کہا ”یہ دیکھو میرا نکاح نامہ، اسے پڑھ لو، یہ دیکھو میرا نام لکھا ہوا ہے۔“ اس نے شہادت والی انگلی اپنے نام کے اوپر رکھی، میں ہنستے ہوئے بولا ”میں نہیں مانتا اس کاغذ کو ایسے کاغذ تو ہر گھر میں ہوتے ہیں،“ اس نے بھیگی آنکھوں سے میرے چہرے کی طرف دیکھا، مجھے ہنسی آ گئی، ثمرین روتی ہوئی بولی۔ ”مان جاؤ میں تمہاری نہیں رہی، میں کسی اور کی ہو چکی ہوں۔“

”پھر کیا کروں؟ اس کاغذ کو پرس میں ڈال لو، کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس کا جہاز بنا کر اڑا دوں۔“ اس نے ڈرتے ہوئے نکاح نامہ پرس میں ڈال لیا، اس کے آنسوؤں نے اس کی نقاب والی چادر کو بھگو دیا تھا، تنگ گلی ختم ہونے والی تھی۔ اس کے قدموں میں تیزی آ گئی، وہ مجھ سے آگے نکل گئی، میں پیچھے رہ گیا، میری آنکھوں میں آنسو نہیں آ رہے تھے، وہ روتی ہوئی جا رہی تھی، میں نے چلتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا، آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے، ان بادلوں کو یاں بھری آنکھوں سے دیکھ کر بڑبڑایا، بہت گھٹن ہے۔



عید سے کچھ دن پہلے اس نے خط لکھا کہ مجھے آخری بار ملو۔ اس نے رات کا وقت لکھ دیا تھا، ساتھ یہ بھی لکھا کہ چوڑیاں ضرور لانا، مجھے اپنے ہاتھوں سے پہنانا..... میری یہ آخری خواہش ضرور پوری کرنا..... اس نے آخری ملاقات کے لیے جو رات چنی

وہ چاند رات تھی، میں نے دن کو شہر سے چوڑیاں خرید لیں، ہمیں رات کے پچھلے پہر ملنا تھا، اس رات مجھے ایک پل چین نہ آیا، ہماری زندگی کی آخری ملاقات ہونے والی تھی۔ وہ میری نہیں رہی تھی، اس کے باوجود رات کے سناٹے میں مجھ سے ملنا چاہ رہی تھی۔ وہ موسم سرما کی سرد رات تھی، چار سو تھوڑی تھوڑی دھند تھی، دھند نیچے تھی، اوپر آسمان صاف تھا اور ستارے چمک رہے تھے۔ میں ملاقات کی مقررہ جگہ پر آ گیا، اپنے اوپر سے چادر اتار کر نیچے بچھا دی..... اس پر بیٹھ کر سامنے وان کے درخت کو دیکھا، اس رات وان کا درخت کافی سہا ہوا لگ رہا تھا، اس رات مجھے ثمرین کا پہلے کی طرح انتظار نہ تھا، میں سردی سے کانپ رہا تھا۔ جیب سے چوڑیاں نکال کر نیچے چادر کے کونے پر رکھ دیں، زندگی میں پہلی بار چوڑیاں خریدیں، اندازے سے ہی خرید لایا، اگلی صبح عید تھی..... چاند رات کے پچھلے پہر وہ مجھ سے آخر ملاقات کرنے آ رہی تھی، حالانکہ اب ملاقات بے سود تھی، شاید وہ آخری ملاقات کی رسم احسن طریقے سے ادا کرنا چاہتی تھی، بخ سرد ہوا چل رہی تھی، میں وقفے وقفے سے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ثمرین مقررہ وقت سے کچھ منٹ پہلے آ گئی، اس نے خود کو سیاہ شمال میں لپیٹا ہوا تھا، اسے دیکھ کر میں اٹھا، اس کے دائیں ہاتھ میں چھوٹے سائز کی پلیٹ تھی، جس میں ضرور مہندی تھی، پلیٹ نیچے رکھ کر وہ میرے وجود کی دیوار سے لگ کر رونے لگی۔ اس نے مجھے اپنی باہوں کے حصار میں لے لیا، اس کے دونوں ہاتھ میری پیٹھ پر آپس میں مل گئے۔ میرے دونوں بازو آنکھوں کی طرح نیچے جھکے ہوئے تھے۔ آخری ملاقات پر میرے ہاتھ ثمرین کی پیٹھ پر نہ گئے، ثمرین پہلے سے زیادہ رونے لگی، میں نے اسے خود سے جدا کر کے نیچے چادر پر بٹھا دیا، ثمرین میرا چہرہ چومنے کو بے قرار تھی، میں تھوڑا سا پیچھے ہٹ گیا، میں نے چادر کے کونے پر پڑی چوڑیاں اٹھائیں، پہلے اس کے دائیں ہاتھ کو پکڑا، اپنے لرزتے ہاتھوں سے اس کی کلائیوں میں چوڑیاں ڈالنے لگا..... چوڑیاں

پہنانے کا پہلا موقع تھا، اس لیے چوڑیاں ٹوٹ رہی تھیں، کچھ کلائی میں چلی گئیں، دائیں ہاتھ کے بعد اس کے بائیں ہاتھ کو پکڑا، بائیں ہاتھ کی کلائی میں بھی کچھ چوڑیاں چلی گئیں، کچھ ٹوٹ گئیں۔ سرد چاند رات کے پچھلے پہرِ ثمرین کی سسکیاں میری روح میں سوگواریت کی کیفیت پیدا کر رہی تھیں، ثمرین روتی ہوئی مجھے اچھی نہ لگ رہی تھی، میں نے اُداس آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا، آسمان پر چمکتے ستاروں سے کچھ نہ کہہ سکا۔ میرے وجود میں دُکھ سے کپکپاہٹ آچکی تھی، ثمرین میرے وجود کی کپکپاہٹ کو نہ دیکھ سکی تھی، نہ محسوس کر سکی تھی، ثمرین خود تھوڑی تھوڑی کانپ رہی تھی، اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھے، آنسو پونچھتے سے اس کی کلائی کی چوڑیاں کھنکیں، مجھے سمجھ نہ آرہی تھی کہ میں کیا کروں، اس کی چوڑیوں کی کھنک نے مجھے مزید رنجیدہ کر دیا تھا۔ آنسو پونچھنے کے بعد اس نے مہندی والی پلیٹ اٹھائی، اس کا دایاں ہاتھ میرے ہاتھوں کی طرف بڑھ آیا، اس نے میرے دائیں ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ کر اپنے قریب کر لیا، اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے جب میرے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مہندی رکھی تو مجھے ایسا لگا جیسے اس نے میرے ہاتھ پر دُکھ کا پہاڑ رکھ دیا ہو، اس نے کبھی کہا تھا کہ جب ہماری آپس میں شادی ہوگی تو میں اپنے ہاتھوں سے تمہارے ہاتھوں پر مہندی لگاؤں گی، اب چاند رات کے پچھلے پہر وہ میرے ہاتھ پر مہندی رکھ رہی تھی، شاید وہ اپنا وعدہ پورا کر رہی تھی۔ وہ میری ہتھیلی پر تھوڑی سی مہندی رکھ پائی کہ میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ وہ میرے تمام ہاتھ پر مہندی لگانا چاہتی تھی، میں نے مٹھی بند کر لی۔ میں نے کانپتے بائیں ہاتھ سے ثمرین کو اپنے قریب کیا، اس کی دونوں آنسو بھری آنکھوں کا ایک ایک بوسہ لیا..... میں اٹھا تو وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں نے کہا، جاؤ۔ وہ رونے لگی، میں نے دوبارہ کہا، جاؤ..... وہ روتی ہوئی مجھ سے جدا ہو گئی، اندھیرے میں مجھے تنہا چھوڑ گئی، اندھیرے نے مجھے چاروں طرف سے

گھیر لیا، چاند رات کے پچھلے پہر میں کھجور کے سہمے ہوئے پیڑ کے نیچے کھڑا ہو کر سامنے دان کے سہمے ہوئے پیڑ کو یاں بھری آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میری آنکھوں کے پیمانوں سے جام چھلکتے..... میں نیچے جھکا، بائیں ہاتھ سے چادر اٹھائی، تمام ٹوٹی چوڑیاں نیچے گر پڑیں، چادر جھاڑ کر اپنے اوپر کی اور چل پڑا..... واپس آتے ہوئے میرا سر جھکا ہوا تھا۔ میں دونوں جہاں ثمرین کی محبت میں ہار کر آ رہا تھا۔ گھر آ کر چارپائی پر لیٹ گیا، جلدی سے اوپر رضائی کر لی، میری آنکھیں تھوڑی تھوڑی بھیگ چکی تھیں، میرا رونے کو بہت دل کر رہا تھا، میں نے خود سے کہا، 'رو لے آج جتنا رونا ہے' پھر کبھی ایسا موقع نہ ملے گا، کمرے میں گھپ اندھیرا تھا، اس کے باوجود میں نے تکیہ آدھا سر کے نیچے آدھا اوپر کر لیا، آنسو آنکھوں سے بہتے رہے اور تکیے میں جذبہ ہوتے رہے۔ میں چاند رات کے آخری پہر زندگی میں سب سے زیادہ رویا۔ شاید اس لیے زیادہ رویا کہ یہ میری زندگی کا آخری رونا تھا، میں روتے روتے سو گیا۔

اگلا دن عید کا تھا، میں کچھ دیر سے اٹھا، نہ کچھ کھایا، نہ کپڑے بدلے، منہ ہاتھ دھوئے بغیر گھر سے نکل پڑا، میرے دائیں ہاتھ کی مٹھی بند تھی، اس بند مٹھی میں مہندی تھی، میں چلتا ہوا نہر کی پٹری پر آ گیا، عید کا آدھا دن نہر کی پٹری پر جاتے اور آدھا واپس آتے گزارا، اس دن میں کسی دوست یا جاننے والے سے نہ ملا، نہ کسی کو سلام کیا، سارا دن میرے دائیں ہاتھ کی مٹھی بند رہی، مہندی سوکھ چکی تھی، میں پھر بھی مٹھی نہ کھول رہا تھا، شام کے وقت مٹھی کھولی، نہر کے پانی سے ہاتھ دھویا، میری ہتھیلی پر مہنگی کا رنگ خوب چڑھا تھا، جب سورج ڈوب گیا، چار سواندھیرا ہو گیا تب میں گھر آیا.....



میرے شب و روز دکھ اور اذیت میں گزرتے رہے۔ غمِ رین کی شادی کے دن مقرر ہو گئے، پھر شادی فریب آ گئی، تین دن کے بعد ثمرین کی شادی تھی۔ میں نے کافی

سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ مجھے چار پانچ دنوں کے لیے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ سردی کا موسم اختتام پذیر ہو رہا تھا رات کے ساڑھے آٹھ کا وقت تھا جب میں گھر سے نکلا۔ گھر سے نکلنے کے وقت میں نے آسمان کی طرف دیکھا، آسمان پر ستارے چمک رہے تھے، گھر سے باہر آ کر رُک کر میں نے آسمان پر چمکتے ستاروں سے کہا، آخری بار ثمرین کی ایک جھلک دکھاؤ میں جاتے ہوئے ثمرین کی ایک جھلک دیکھنا چاہتا ہوں۔ رکنے کے بعد میرے قدم اٹھنے لگے، مجھے ثمرین کے گھر کے آگے سے گزرنا تھا، جب میں ان کے گھر کے سامنے آیا، ان کے گھر کی جانب دیکھا، ان کے گھر کا باہر والا دروازہ کھلا تھا، گھر کے صحن میں بلب کی روشنی تھی، ثمرین اپنے گھر کے صحن میں کھڑی باہر والے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میرے قدم رُک گئے، میں رُک کر اسے دیکھنے لگا، وہ باہر کسے دیکھ رہی تھی جبکہ باہر اندھیرا تھا..... میں نے ممنونیت سے آسمان پر چمکتے ستاروں کی طرف دیکھا اور چل پڑا..... چلتا ہوا شہر کی طرف جانے والی سڑک پر آ گیا۔ اس سڑک پر سر جھکائے چلتا رہا.....

چلتا ہوا بسوں کے اڈے پر آ گیا، رات کے سوانو بجے تھے..... اڈے پر لاہور جانے والی بس تیار کھڑی تھی، میں ٹکٹ لے کر بس میں سوار ہو گیا، مجھے کھڑکی کی طرف سیٹ ملی..... میں سیٹ پر بیٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا، اس وقت ایک درمیانی عمر کا شخص میری ساتھ والی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا، اس نے میرے ساتھ ایک دور سی باتیں کیں پھر چپ کر کے میری طرح کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ کچھ دیر باہر دیکھنے کے بعد اس نے اگلی سیٹ کی پشت پر سر رکھ دیا، اب وہ دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ بس چل پڑی، میں شیشے والی کھڑکی سے باہر اندھیرے میں روڈ کے ساتھ درختوں کو پیچھے جاتے دیکھ رہا تھا، پچھلی گزری دو راتیں میں صحیح طرح سو نہ سکا تھا، اس کے باوجود مجھے نیند نہ آرہی تھی۔ بس لاہور کی جانب بھاگی جا رہی تھی، لاہور اپنے دوست نثار کے پاس جا رہا تھا۔

وہی میرا کلاس فیلو نثار جسے کلاس میں سب سے امیر سمجھتا تھا جو بعد میں میری کہانیاں پڑھ کر میرا دوست بنا۔ ان دنوں نثار لاہور میں ایک پرائیویٹ فرم میں نوکری کر رہا تھا۔ کھڑکی سے باہر پیچھے جاتے درختوں کو دیکھ کر میں سوچ رہا تھا کہ جب نثار مجھے اپنے سامنے دیکھے گا تو کافی خوش ہوگا، پھر میری مخدوش حالت سے جان جائے گا کہ میں اس کے پاس کس لیے آیا ہوں، وہ مجھ سے بہت کچھ پوچھے گا..... میں اس سے زیادہ نہیں چھپاؤں گا، مجھ سے جو سوال کرے گا اس کا صحیح جواب دوں گا، اسے ثمرین کی شادی کا بتا دوں گا، وہ مجھے سنبھال لے گا، چار پانچ دن اس کے پاس ہی رہوں گا، اس کے پاس جاتے ہی مجھے نیند آجائے گی، وہ میری حالت سے اندازہ لگا لے گا کہ میں کتنی اذیت میں ہوں، وہ میرا بہت خیال رکھے گا، میں کھڑکی سے باہر اندھیرے میں پیچھے بھاگتے درختوں کو دیکھ کر سوچتا رہا اور بس لاہور کی جانب بھاگتی رہی۔

فجر کی اذان کے وقت بس لاہور پہنچی، میں بس سے اُترا، اس وقت لوگ مسجدوں سے فجر کی نماز پڑھ کر نکل رہے تھے، جس اسٹاپ کا نثار نے خط میں لکھا، میں اُس پر اُترا، اُترنے کے بعد روڈ کے ساتھ بنے فٹ پاتھ پر چلنے لگا، میں گھر سے چادر لانا بھول گیا تھا، صبح کے وقت سردی محسوس ہو رہی تھی، میں روڈ پر چلتی ٹریفک کو دیکھتے ہوئے فٹ پاتھ پر چلتا رہا۔ دن نکل آیا، دکانیں کھل گئیں، اسی روڈ پر نثار کرائے کے مکان میں رہ رہا تھا، مجھے اس مکان پر پہنچنا تھا، ایک دکاندار سے پوچھنے کے بعد آخر نثار کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ باہر والا دروازہ کھٹکھٹایا، پہلی دستک پر ہی دروازہ کھل گیا، دروازہ کھولنے والا نثار تھا، اس نے مجھے حیرانگی سے دیکھا، بغلیں ہوا اور مجھے پکڑے مکان کے اندر لے آیا۔ ایک کمرے میں لا کر چار پائی پر بٹھا دیا، مجھے بٹھا کر جلدی سے ناشتے کا بندوبست کیا، ابھی اس نے ناشتہ نہ کیا تھا، ہم دونوں نے مل کر ناشتہ کیا، ناشتے کے دوران نثار مجھ سے روزمرہ کے سوال پوچھتا رہا کہ ”تمہیں میری یاد کیسے آگئی؟ لاہور کیسے آنا ہوا؟ ضرور کسی

رسالے کے ایڈیٹر سے ملنے آئے ہو گے..... تمہاری تیکھی اور تلخ کہانیوں نے دھوم مچائی ہوئی ہے کہ کسی اور کام کے سلسلے میں آئے ہو؟“ میں جواب میں ہنستے ہوئے گویا ہوا۔

”بس ایسے ہی آگیا“ اس بہانے تم سے بھی ملاقات ہو گئی..... بہت اچھا لگ رہا ہے، ادھر میری کہانیوں کی اتنی دھوم مچی ہوئی ہے یہ بھی تم سے معلوم ہوا ہے۔“ نثار سے باتیں ہوتی رہیں، اس دن نثار آفس نہ گیا، اس نے مجھے گھمانے پھرانے کی بات کی تو میں نے انکار کر دیا۔ اس نے کہا دن کیسے گزرے گا؟ کسی سینما گھر چلتے ہیں، میں نے پھر انکار کر دیا، مجھے نیند آرہی تھی، تین راتوں کا رتجگا تھا، میں سونا چاہتا تھا، اسے میری اداس حالت کی سمجھ نہ آرہی تھی، وہ لاہور کی باتیں کر رہا تھا، دو تین گھنٹے ہم باتیں کرتے رہے، نثار میرے اندر کی حالت کو نہ جان سکا، جب مجھے یقین ہو گیا کہ نثار میرے دکھ کو نہ سمجھ سکے گا تب میں نے اسے کہا ”ایاز کے پاس چلتے ہیں“ نثار نے خوش ہوتے ہوئے کہا ”چلو اس سے ملنے کے بہانے کچھ گھوم پھر لیں گے۔“

ایاز میرا قلمی دوست تھا، کچھ سال پہلے میں لاہور آیا تو اس کے ہاں تین راتیں رہا، اس نے کافی اچھا برتاؤ کیا تھا، شاید ایاز میری مخدوش حالت کو جان جائے، یہی سوچ کر میں نے نثار کو ایاز کے پاس چلنے کا کہا، ایک گھنٹے کے بعد ہم اُس کارخانے میں تھے جس میں ایاز کام کرتا تھا، ایاز نے مجھے اور نثار کو دیکھا تو مشین بند کر دی، اس کے دو ساتھی اپنی اپنی مشینوں پر کام کرتے رہے، ایاز گرم جوشی سے ملا، بغلیں ہونے کے بعد وہ ہمیں کارخانے کے ساتھ بنے کوارٹرز میں سے ایک کوارٹر میں لے آیا، یہ وہی کوارٹر تھا جس میں، میں تین راتیں رہ کر گیا تھا، ہم جوتے اتار کر نیچے قالین پر بیٹھ گئے، ایاز نے جلدی سے چائے اور بسکٹ کا بندوبست کیا۔ قالین پر بیٹھے ہوئے مجھے شدت کی نیند آرہی تھی، ایاز مجھ سے ہنس کر باتیں کر رہا تھا، نثار اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ میں نے ایک دو بسکٹ کھائے، چائے کا کپ پیا، چائے کے بعد ایاز مجھ سے نثار کی طرز کے

سوالات پوچھنے لگا، جس طرح میں نے نثار کو جوابات دیے اسی طرح ایاز کو دیے۔ باتوں کے دوران میں دو تین بار اونگھا، نیند سے میری آنکھیں بوجھل تھیں، دونوں روزمرہ کی باتوں میں مشغول ہو گئے، کرکٹ اور اسٹیج ڈراموں کی باتیں کر رہے تھے۔ الحمرا میں یہ..... تما شیل میں یہ ڈرامہ چل رہا ہے، نثار نے مجھ سے پوچھا ”پچھلے ون ڈے میں انضمام کی بیٹنگ دیکھی؟“ میں جواب میں خاموش رہا، دل میں کہا مجھے نیند آرہی ہے۔ ”اور وسیم اکرم کی بولنگ؟“ میں جواب میں خاموش رہا، دل میں کہا مجھے نیند آرہی ہے، نثار اور ایاز دونوں ہنسنے لگے، ایاز نے پوچھا ”کہاں کھو گئے؟“ میں نے کہا ”کہیں نہیں.....“ میں ان کی باتوں کے جواب میں ہوں ہاں کرتا رہا، پھر اٹھا اور نثار سے کہا ”اٹھو چلیں۔“ ایاز نے کہا ”ایسے کیسے؟ کھانا کھا کر جانا۔“ میں جوتے پہن کر کواٹر سے باہر آ گیا، میرے پیچھے نثار اور ایاز بھی باہر آ گئے، میں نے ایاز سے الوداعی مصافحہ کیا، چلتا ہوا باہر گلی میں آ گیا، میرے پیچھے نثار بھی آ گیا، میں اور نثار ساتھ ساتھ چلنے لگے، گلی کے بعد روڈ پر آ گئے، روڈ پر زوروں کی ٹریفک تھی، روڈ کے ساتھ بنے فٹ پاتھ پر پیدل چلتے رہے، نثار نے دو تین بار کہا ”وگین رکواؤں؟“ میں نے جواب میں کہا ”نہیں کچھ پیدل چلتے ہیں۔“ نثار میرے ساتھ چلتے ہوئے لاہور کی باتیں کر رہا تھا، میں اس کے ساتھ پیدل اس لیے چل رہا تھا کہ شاید اسے میری کیفیت تھوڑی سی سمجھ آ جائے، مجھ سے اتنا ہی پوچھ لے کہ تمہیں کیا ہوا ہے؟ تم رات کا سفر کر کے آئے ہو، سولو، اندازاً دو ڈھائی کلو میٹر پیدل چلنے کے بعد میں نے اسے کہا ”مجھے قصور جانے والی بس میں بٹھا دو۔“ نثار سوالات کرنے لگا، میں نے اس کے کسی سوال کا جواب نہ دیا، میں نے کچھ نہ بتایا کہ میں قصور کس کے پاس جا رہا ہوں، اس نے رُک کر ایک وگین کو ہاتھ کے اشارے سے روکا، ہم اس میں سوار ہو کر اڈے پر آ گئے، اس نے مجھے قصور جانے والی بس میں بٹھا دیا، خود کھڑکی کی طرف آ کر کھڑا ہو گیا، بس چلنے تک وہ کھڑکی کے پاس کھڑا مجھ سے باتیں کرتا

رہا مجھ سے پوچھنے میں ناکام رہا کہ میں قصور کیوں جا رہا ہوں؟ جب بس چلنے لگی تو اس نے ہاتھ ملایا، بس چل پڑی..... میں نے کھڑکی سے پیچھے نہ دیکھا، میں آگے دیکھ رہا تھا۔ شام کا وقت تھا، سورج ڈوب رہا تھا، بس لاہور سے باہر آنے کے بعد قصور کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔

جب میں قصور کے بس اسٹینڈ پر اترا، رات ہو چکی تھی، بس سے اتر کر ایک رکشہ میں بیٹھ گیا، میں نے رکشے والے کو بابا بلھے شاہ کے دربار پر چلنے کا کہا۔ رکشہ چل پڑا، رکشے والے نے مجھے بابا بلھے شاہ کے دربار پر اتارا، اسے کرایہ دینے کے بعد میں دربار کی حدود میں آ گیا۔ دربار کے ساتھ بنی مسجد سے لوگ عشاء کی نماز پڑھ کر نکل رہے تھے، دربار کے نزدیک آ کر میں نے جوتے اتار کر ہاتھوں میں لیے، ننگے پاؤں چلتا ہوا بابا بلھے شاہ کے سادہ اور بغیر گنبد کے دربار کے قریب آ گیا۔ دربار کے آگے مجھے ایک کمرہ نظر آیا، یہ زائرین کے رہنے کے لیے بنایا گیا تھا، پہلے میں اس کمرے کی طرف آیا، اس کا دروازہ کھلا تھا، میں اندر داخل ہو گیا۔ بلب جل رہا تھا، اندر کوئی نہ تھا، میں نے جوتے رکھے اور باہر آ گیا۔

بابا بلھے شاہ کے دربار کے قریب کھڑا ہو گیا، کچھ وقت اس کے بغیر گنبد کے دربار کو دیکھتا رہا، اس کی دیواروں پر لکھے بابا بلھے شاہ کے شعر پڑھتا رہا، پھر مغربی طرف بنی پکی قبروں میں سے ایک قبر کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ عشاء کی نماز کے بعد لوگوں کا رش بڑھ گیا، تمام لوگ نیچے بیٹھ گئے، قوال آچکے تھے، وہ پہلے خاموش تھے، شاید عشاء کی نماز کے احترام کے لیے خاموش تھے۔ جب انہوں نے دیکھا لوگ عشاء کی نماز پڑھ کر آچکے ہیں تو قوالی شروع کر دی، قوالی کے بول تھے۔ ”نی میں جانا جوگی دے نال“ قوالی نے میرے دل کی اداسی میں مزید اضافہ کر دیا۔ میں بابا بلھے شاہ کے دربار کو بار بار دیکھ رہا تھا، اس کے بعد میری آنکھیں آسمان پر چمکتے ستاروں پر ٹھہر گئیں، میں عشق کے

بے حد مشکل عمل میں تھا۔ رات کے بارہ بجے تک بابا بلھے شاہؒ کے احاطے میں قوالی ہوتی رہی، بارہ بجے کے بعد ایک ایک کر کے لوگ اٹھنے لگے۔ قوالی بند ہو گئی، قوال اٹھ کر چلے گئے، احاطے میں، میں اور دو افراد اور رہ گئے، ایک سفید داڑھی والا بابا اٹھ کر میرے قریب آیا، اس نے مجھ سے پوچھا ”کہاں سے آئے ہو؟“ میں نے شہر کا نام بتادیا، اس نے شناختی کارڈ مانگا، میرا ہاتھ جیب کی طرف گیا تو اس نے کہا ”رہنے دو۔ بابا جی کی محبت تمہیں بہت دُور سے کھینچ لائی ہے، میں یہاں کا مجاور ہوں بلکہ بابا جی کا غلام ہوں، جب نیند آنے لگے تو اُس کمرے میں جا کر سو جانا۔“

سفید داڑھی والا بابا اتنا کہہ کر دربار کی طرف چل دیا، وہ چلتا ہوا بابا بلھے شاہؒ کے دربار کے اندر چلا گیا، میں بابا بلھے شاہؒ کے دربار کو یاس والہم میں مبتلا آنکھوں سے دیکھتا ہوا کمرے میں آ گیا۔ نیچے ایک پرانا قالین بچھا ہوا تھا، کمرے میں میرے سوا کوئی نہ تھا، قالین پر لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی، اگلے دن میں کچھ دیر سے اٹھا، باہر آیا، بابا بلھے شاہؒ کے دربار کے احاطے میں لوگوں کا رش تھا، میں مسجد سے منہ ہاتھ دھو کر واپس اُسی قبر کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، جس کے ساتھ ٹیک لگا کر رات کو بیٹھا تھا۔ بوڑھا مجاور میرے لیے لنگر لے آیا، میں نے لنگر کھایا، لنگر کھانے کے بعد اٹھ کر واپس کمرے میں آیا، اپنے جوتے اٹھائے اور بابا بلھے شاہؒ کے دربار کی حدود سے باہر آ گیا۔ مغرب کی طرف جانے والے راستے پر چلنے لگا، قصور شہر کی دکانیں کھل چکی تھیں، میں دکانوں کو دیکھتا ہوا روڈ پر چلتا رہا۔ کچھ وقت چلنے کے بعد قصور کے ریلوے اسٹیشن پر آ گیا، ریلوے اسٹیشن پر اکا دکا لوگ تھے، شاید گاڑی جا چکی تھی، دوپہر تک میں اسٹیشن پر رہا۔ اسٹیشن پر کسی قسم کا شور شرابہ نہ تھا، میں ایک بیچ پر کافی وقت لیٹا رہا، دوپہر کے بعد اٹھا، اسی روڈ پر چلتے ہوئے واپس بابا بلھے شاہؒ کے دربار پر آ گیا۔ دو راتیں بابا بلھے شاہؒ کے دربار پر رہنے کے بعد میں نے بابا بلھے شاہؒ کو الوداع کہہ دیا۔.....

دربار سے باہر آنے کے بعد اسی روڈ پر چلتا ہوا قصور کے اسٹیشن پر آ گیا، اسٹیشن پر کافی گہما گہمی تھی، بیٹچوں پر مسافر اپنے اہل و عیال کے ساتھ بیٹھے تھے، میں بھی ایک بیٹچ پر بیٹھ گیا، سامنے گاڑی کی لائنوں کو دیکھ کر سوچنے لگا، ابھی میں اپنی سوچوں میں منہمک تھا کہ گاڑی آ گئی، مسافر اترنے اور چڑھنے لگے، ڈبوں کی کھڑکیوں سے لوگ باہر جھانک رہے تھے، میں بیٹچ پر بیٹھا رہا، کچھ وقت گاڑی رکنے کے بعد چل دی، میری آنکھیں جاتی گاڑی کو دیکھتی رہیں، جب گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں بیٹچ سے اٹھا، اس سمت چل پڑا جس سمت گاڑی گئی تھی، اسٹیشن کی حدود سے نکلنے کے بعد گاڑی کی لائن کے اوپر آ گیا، گاڑی کی لائن پر چلنے لگا، قصور شہر پیچھے رہ گیا، گاڑی کی لائن کے دونوں اطراف ہریالی ہی ہریالی تھی، میں گاڑی کی لائن پر چلتا رہا۔ سہ پہر کے وقت میں گاڑی کی لائن کے ساتھ اگے کیکر کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا، آنکھیں بند کیں تو گاؤں نظر آنے لگا، گاؤں کا ایک ایک گھر آنکھوں کی اسکرین پر صاف نظر آ رہا تھا، شمرین کے گھر کافی گہما گہمی تھی، عورتوں اور مردوں کا رش تھا، مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا، میں نے گھبرا کر جلدی سے آنکھیں کھولیں کہ منظر غائب ہو جائے گاؤں کا منظر غائب نہ ہوا، سامنے گاڑی کی لائن نہیں، گاؤں نظر آ رہا تھا، قبرستان میں کھجور اور وان کے پیڑ اور سرکنڈوں کے جھنڈ، شمرین کے گھر کے آگے سے گزرتی سڑک شمرین کے گھر کا دروازہ ان کے گھر کا صحن، صحن میں ڈالی چار پائیاں، ان چار پائیوں پر بیٹھے لوگ۔ اندر کمرے میں لڑکیوں کی میزمرہنسی، ان لڑکیوں کے جھر مٹ میں شمرین بیٹھی نمایاں نظر آ رہی تھی۔ شمرین کے ہاتھ مہندی سے رنگے ہوئے تھے اس کے پاؤں پر بھی مہندی لگی ہوئی تھی، آنکھوں میں کاجل اور ہونٹوں پر لپ اسٹک لگی ہوئی تھی، میری نہیں کسی اور کی دُہن بنی بیٹھی تھی، اس کے کانوں میں سونے کی بالیاں تھیں، ہاتھوں کی کلائیاں کانچ کی چوڑیوں سے بھری ہوئی تھیں، اس نے سرخ رنگ کا جوڑا پہنا ہوا تھا، اس کی سہیلیاں اسے چھیڑ رہی تھیں، اس کی

کا جل بھری آنکھوں کے کنارے بھیگے ہوئے تھے اس کے باوجود وہ اپنی سہیلیوں کی باتوں پر ہنس رہی تھی، کچھ کچھ شرماری تھی، بارات آنے والی تھی، وہ اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں ڈھن کے روپ میں کافی خوبصورت لگ رہی تھی، کمرے کا ایک طاق بند تھا..... اندر بلب جل رہا تھا اس کی ناک میں سونے کا کواچمک رہا تھا۔ ان کے صحن میں عورتوں اور مردوں کا اضافہ ہو رہا تھا، بارات گاؤں کے قریب آچکی تھی..... ڈھول کی آواز پر اس کی سہیلیاں اسے زیادہ چھیڑنے لگیں..... بارات ان کے گھر کے دروازے کے آگے آگئی، ڈھلے کے سر پر سہرا بندھا ہوا تھا، گلے میں بار ڈالے ہوئے تھے، ڈھلے پر سے نظر ہٹانی چاہی تو نظر نہ ہئی۔ مجھ میں دکھ کی شدت سے شدید گھبراہٹ آچکی تھی، میرا دل گھبرا رہا تھا..... شمرین کے گھر کا منظر میری آنکھوں کے سامنے سے غائب نہ ہو رہا تھا، بارات کے ساتھ آئے لوگ گھر میں داخل ہو کر چار پائیوں پر بیٹھ چکے تھے، بارات کو کھانا دیا گیا، کھانا کھانے کے بعد رخصتی کی باتیں ہونے لگیں، کچھ وقت کے بعد ان کے گھر سرخ رنگ سے ڈھکی ڈولی آگئی۔ ڈھن اندر بیٹھی تھی، ڈولی کو دیکھ کر میری آنکھیں بھیگ گئیں..... ڈولی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوئی، میری آنکھوں کے آنسو پلکوں کے ساحل سے ٹکرا کر واپس آنکھوں کے سمندر میں لوٹ گئے، ڈھن کو ڈولی میں بٹھانے کی باتیں ہونے لگیں، رخصتی کا وقت آچکا تھا، شمرین رونے لگی تھی، اس کی آنکھوں کا کا جل خراب ہو رہا تھا، اس کی ماں اور کچھ رشتے دار عورتیں کمرے میں آ گئیں، اسے اٹھانے لگیں تو اس نے اٹھنے سے انکار کر دیا، اس نے روتے ہوئے کہا ”میں ڈولی میں نہیں بیٹھوں گی۔“

اس کی ماں، رشتے دار عورتیں اور اس کی سہیلیاں مہبوت رہ گئیں، اس کی ماں روتی ہوئی بولی ”اٹھ بیٹی، شمرین نے پھر اٹھنے سے انکار کر دیا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، مجھے شمرین کا چہرہ اپنے بہت قریب نظر آ رہا تھا، اس وقت میرا دایاں ہاتھ

ثمرین کی دائیں کلائی کے اوپر آ گیا، اس کی کابی کی چوڑیاں کھنکیں..... میرے ہاتھ نے اس کی کلائی چوڑیوں کے اوپر سے پکڑی، دو تین چوڑیاں ٹوٹ گئیں..... میں نے اسے کہا ”اٹھو۔“ ثمرین روتی ہوئی اٹھنے لگی، اس کی ماں، رشتے دار عورتیں اور اس کی سہیلیاں ششدر ہو کر اسے دیکھ رہی تھیں، جب ثمرین اٹھی تو تمام باری باری اس کے گلے لگیں، تمام کی آنکھوں میں آنسو تھے، میں اسے کلائی سے پکڑے باہر لے آیا، میرے بائیں ہاتھ نے ڈولی پر ڈالے سرخ رنگ کے کپڑے کو تھوڑا سا ہٹایا، ثمرین کو ڈولی کے اندر بٹھانے کے بعد کلائی چھوڑ دی..... کہاروں نے ڈولی اٹھائی..... میں نے شدت غم سے گھبرا کر آنکھیں کھولیں، سامنے گاڑی کی لائن نظر آنے لگی۔ اب میری آنکھوں کے سامنے گاڑی کی لائن تھی، اس کے علاوہ کوئی منظر نہ تھا، میں کیکر کے نیچے سے اٹھا، چلتا ہوا گاڑی کی لائن پر آ گیا، اس کے اوپر میرے قدم اٹھنے لگے.....

شام ہو چکی تھی، سورج ڈوب رہا تھا، میں گاڑی کی لائن پر چلتا رہا، رات شروع ہو گئی، مغرب کے آسمان پر اُدھورا چاند نظر آنے لگا، چاند کی تین یا چار تاریخ میں اُدھورے چاند کو دیکھتے ہوئے گاڑی کی لائن پر چلتا رہا، چاند نیچا ہوتا گیا، نیچے ہوتا ہوتا آخر مغرب کے بحر میں ڈوب گیا، گاڑی کی لائن پر جس سمت میں جا رہا تھا، اُدھر روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ کوئی شہر قریب آ چکا تھا، میں گاڑی کی لائن پر چلتا ہوا، اس شہر کے اسٹیشن پر آ گیا، اسٹیشن ویران تھا۔ اسٹیشن شہر کے مضافات میں تھا، میں ایک بیٹنج پر بیٹھ گیا۔ کچھ وقت بیٹنج پر بیٹھنے کے بعد اٹھا اور چلتا ہوا اس سڑک پر آ گیا، جو شہر کی طرف جا رہی تھی۔ اس سڑک کے بائیں طرف شہر کا قبرستان تھا، ایک قبر پر دیا جلتا نظر آیا تو میں رُک گیا، شہر کی طرف جانے کی بجائے قبرستان میں داخل ہو گیا۔ جس قبر پر دیا جل رہا تھا، اس قبر کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا، کچھ دیر کھڑا قبر کو دیکھتا رہا۔ پھر قبر کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، میری آنکھیں قبر پر جلتے دیے کو غور سے دیکھتی رہیں، رات بتتی رہی، دیا جلتا

رہا سیری آنکھیں پیناٹرم کی مشق کی طرح دیے کو دیکھ رہی تھیں۔ رات کا نجانے کون سا پہر تھا کہ دیا بجھ گیا، جونہی دیا بجھا میں اٹھا، واپس مڑا، چلتا ہوا قبرستان سے باہر آ گیا، باہر آ کر اس سڑک پر چلنے لگا جو شہر کی طرف جا رہی تھی، چلتا ہوا شہر میں داخل ہو گیا، شہر کے بازار اور گلیوں میں سناٹا تھا، اکا دکا لوگ نظر آ رہے تھے، جو مسجدوں کی طرف جا رہے تھے۔ مسجد کے اسپیکرز سے فجر کی اذانیں گونج رہی تھیں، میں نے ایک شخص سے اڈے کا پوچھا، اس نے مجھے اڈے کا راستہ بتایا اور آگے مسجد کی طرف چل دیا۔ میں اس کے بتائے راستے پر چلتا ہوا اڈے پر آ گیا، اڈے پر جانے کے لیے بس تیار کھڑی تھی، بس میں داخل ہو گیا، اندازاً آدھے گھنٹے کے بعد بس چلی، اس بس میں بیٹھ کر ایک بڑے شہر میں آیا، اس شہر کے اڈے سے ایک بس میں بیٹھ کر اپنے شہر آ گیا، جب میں اپنے شہر کے اڈے پر اترا تو دن کے نوبے تھے، اڈے پر مجھ سے ایک پل نہ رکا گیا، چلتا ہوا گاؤں کی طرف جانے والی سڑک پر آ گیا، میں جلد از جلد اپنے گھر پہنچنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے شدید نیند آ رہی تھی.....



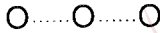
چار سال کا عرصہ بیت گیا، چار سال کیسے گزرے؟ یہ میں جانتا تھا یا پھر خدا جانتا تھا، میں نے خود کو کئی بار مرتے، مرکز زندہ ہوتے دیکھا۔ ان چار سالوں میں، میں نے خدا سے بہت باتیں کیں..... جب بھی خدا سے ہمکلام ہوا، اسے یہی کہا خدا! یہاں میرا دل نہیں لگتا، مجھے گھٹن محسوس ہوتی ہے..... مجھے اپنے پاس بلا لے..... میں یہاں خوش نہیں ہوں۔ زندگی کا شیرازہ بکھر چکا ہے، روح منتشر ہو چکی ہے۔ میں ہر رات آسمان کی جانب یا سیت بھری آنکھوں سے دیکھتا، چاند سے دوست کی طرح گفتگو کرتا، جس رات چاند نہ ہوتا ستاروں سے گفتگو ہوتی، جب رات کے سنائے میں چاند ستاروں سے باتیں کرتا تو مجھے ایسے محسوس ہوتا جیسے کوئی ہے، خدا کی کائنات میں کوئی ایسی ہستی جس سے

میرا روح کا رشتہ ہے، جو مجھے برسوں سے جانتی ہے، جس طرح میں حساس ذہن کا مالک تھا، ثمرین کی ناکام محبت کے بعد اتنا عرصہ میرا زندہ رہنا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ چاند ستاروں سے خود کلامیاں بڑھتی گئیں، چار سالوں میں جتنی کہانیاں، افسانے لکھے ان میں تلخی اور یاسیت تھی۔ ان کہانیوں، افسانوں میں چاند ستاروں سے خود کلامیوں کے تذکرے تھے، کہانی، افسانہ لکھنے کے دوران مجھ سے ”روشنی“ کا نام کئی بار لکھا گیا۔ حالانکہ کہانی، افسانہ میں کردار کا نام کوئی اور ہوتا، کردار کے نام کی جگہ روشنی لکھ بیٹھتا، پھر مجھے روشنی مٹانا پڑتا، میں چاند ستاروں سے پوچھتا، جس ہستی کے متعلق میں سوچتا ہوں، کیا اس کا نام روشنی ہے؟ اگر روشنی ہے تو وہ کہاں ہے؟ کہ روح کی آنکھوں کی روشنی ایک ہستی کی صورت نظر آتی ہے؟

ساڑھے چار سال کے بعد زمین نام کی ایک لڑکی کا مجھے خط موصول ہوا، جو اس نے مجھے فین کے طور پر لکھا، زمین میری تحریروں کی فین تھی۔ کاپی کے ورق پر پانچ چھ لائنوں کا خط تھا، میں نے اس خط کو بار بار پڑھا، اس کے ایک ایک لفظ پر غور کیا، کبھی اتنی توجہ سے کسی کا خط نہ پڑھا تھا۔ میں ایک ادیب تھا، میرے نام لڑکیوں، لڑکوں کے خط آتے رہتے تھے، کئی خط کافی بڑے ہوتے، تفصیل سے لکھے ہوتے۔ زمین کا پانچ چھ لائن کا خط تھا، جسے میں نے بار بار پڑھا، جن رسائل میں، میں لکھتا تھا، ان میں سے ایک رسالے کو زمین، ذوق و شوق سے پڑھتی تھی۔ اس رسالے میں میری کہانیاں، افسانے مستقل شائع ہوتے تھے، زمین نے اپنے پہلے مختصر خط میں ایڈریس نہ لکھا، میں نے زمین کے خط کو بار بار اس لیے پڑھا کہ اس کا اندازِ تحریر بالکل ثمرین جیسا تھا، میں نے ایک ایک لفظ پر غور کیا تھا، زمین کا ہر لفظ ثمرین کا لکھا ہوا لگ رہا تھا، زمین کے مختصر خط کو سامنے رکھ کر ثمرین کے سیکڑوں خط پڑھے، زمین کے تمام فقرے ان خطوں میں مل گئے، کوئی لفظ آگے پیچھے نہ ہوا تھا۔

زمین کے پہلے مختصر خط کے بعد چاند ستاروں سے خود کلامیاں بڑھ گئیں..... میں رات کو چاند سے پوچھتا..... یہ زمین کون ہے؟ چاند خاموشی کو اوڑھے کائنات پر اپنی روشنی بکھیرتا رہتا پھر ستاروں سے پوچھتا، چاند نے نہیں بتایا، تم بتاؤ، زمین کون ہے؟ جواب میں ستارے سنائے کو اوڑھے چمکتے رہتے۔ تین ماہ کے بعد زمین کا دوسرا خط آ گیا، یہ خط بھی مختصر تھا، اس خط میں بھی اس نے اپنا ایڈریس نہ لکھا تھا، یہ خط بھی پہلے خط کی طرح مختصر تھا، کاپی کے ورق پر چھ سات لائن کا خط۔ اس خط کو بھی میں نے بار بار پڑھا، دو ماہ کے بعد اس کا تیسرا خط آ گیا، یہ خط بھی مختصر تھا، اس خط میں بھی اس نے اپنا ایڈریس نہ لکھا، اب میں زمین کے خط کا انتظار کرنے لگا تھا..... انتظار میں شدت آتی جا رہی تھی۔ اب جب میں چاند ستاروں سے باتیں کرتا تو روشنی کے ساتھ زمین کی باتیں بھی ہوتیں، چاند ستاروں سے باتیں کرنے کے دوران میں خود سے پوچھتا، کیا زمین وہی روشنی ہے، جس کی میں چاند ستاروں سے باتیں کرتا تھا؟ جس کی میں چاند ستاروں سے باتیں کرتا ہوں؟ زمین کا چوتھا خط بھی مختصر لکھا ہوا تھا۔ پانچواں خط بھی مختصر تھا، پر اس میں زمین نے اپنا ایڈریس لکھ دیا تھا، زمین کے ایڈریس کو میں نے بار بار پڑھا، مجھے اس کا ایڈریس زبانی یاد ہو گیا، یہ خط بھی اس نے فین کے طور پر لکھا، دوسرے خطوط کی نسبت اس خط میں محبت کے اظہار کا ایک اشارہ تھا، خطوط میں اس سے محبت کا اظہار نہیں ہو رہا تھا، میں نے جواب میں ادیبانہ طرز کا خط لکھا، اس میں محبت کا جوابی اشارہ بھی لکھا، اس خط کا فوری جواب آیا، اس خط میں زمین نے محبت کا اظہار کر دیا، پھر ہمارے درمیان خطوط کا سلسلہ چل پڑا۔ میری روح میں ہلچل مچ گئی، خوش خوش رہنے لگا، صحت اچھی ہو گئی، میری کہانیوں، افسانوں میں تلخی کی بجائے محبت کی چاشنی آ گئی، اب میں ہر روز زمین کے خط کا انتظار کرتا۔ جس دن اس کا خط ملتا میں اسی دن اس کا جواب لکھتا۔ ہماری محبت میں شدت آتی گئی، ہمارے بیچ محبت کا انوکھا بندھن

مضبوط ہوتا گیا۔ میں اپنے حالات اچھے کرنے کی تگ و دو میں لگ گیا۔ زمین نے میرے متعلق اپنے گھر والوں کو بتا دیا۔ اس کی ماں، بڑا بھائی اور بڑی بہن اسے زمانے کی مثالیں دے کر سمجھاتے مگر زمین میرے نام کی تسبیح پڑھتی رہی، میرے نام کا درد کرتی رہی..... اس نے مجھے اپنے تمام خونی رشتوں پر فوقیت دی..... ہم ہر وقت ایک دوسرے کی ٹرانس میں تھے، میرے خط میں تھوڑی سی دیر ہو جاتی تو اس کی جان پر بن جاتی..... اس کا خط لیٹ ہوتا تو میری حالت مضطرب ہو جاتی، زمین کی میرے پاس چار تصویریں تھیں، ہر رات سونے سے پہلے انہیں بار بار دیکھتا، جب دیکھ دیکھ کر آنکھیں تھک جاتیں، پھر سوتا تھا، زمین کے پاس میری آٹھ دس تصویریں تھیں، نجانے وہ انہیں کس کس وقت دیکھتی تھی؟



ایک سال کا عرصہ بیت گیا، دسمبر کے مہینے کے شروع کے دن تھے، میں نے زمین کو جو خط لکھا تھا، اس کا جواب نہ آ رہا تھا، میں کافی بے قرار اور فکر مند تھا، پہلے دس بارہ دنوں کے اندر زمین کا خط آ جاتا تھا، سولہ سترہ دن گزر گئے، زمین کا خط نہ آیا، میری زندگی کا ٹائم ٹیبل درہم برہم ہو گیا..... صحت گرنے لگی، آئینے میں چہرہ دیکھتا تو ایسے لگتا جیسے برسوں کا مریض ہوں۔ رات دواڑھائی بجے تک نیند نہ آتی، انہی دنوں میں نے زمین کو دوسرا خط لکھا، آٹھ دس دن اس کا بھی جواب نہ آیا۔ میری حالت مجنوں جیسی ہو گئی، میں نے زمین کو تیسرا خط لکھ دیا، اس خط میں، میں نے ساتھ والی دکان جو کہ جنرل اسٹور کی تھی، اس کا فون نمبر لکھ دیا۔ جنرل اسٹور کا مالک مٹین میرا دوست بنا ہوا تھا، میری کافی قدر کرتا تھا، میں نے اسے سمجھا دیا کہ جب میرا فون آئے تو مجھے فوراً بلائے.....

مجھے تیسرے خط کے جواب کا شدت سے انتظار تھا..... دسمبر کے آخری دن تھے، راتیں طویل تھیں، اس کے باوجود مجھے اڑھائی تین بجے سے پہلے نیند نہ آتی، تیسرے خط

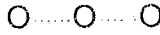
کو ارساں کیے دوسرا دن تھا، شام کا وقت تھا، میں دکان کی واحد کرسی پر اداس بیٹھا سوچے جا رہا تھا، اسی وقت میری سانسوں اور دھڑکنوں میں شدید بے قراری پیدا ہوئی..... سانسوں اور دھڑکنوں میں ایسی بے قراری پہلے کبھی محسوس نہ ہوئی، سانس لینے میں تھوڑی تھوڑی دشواری پیش آرہی تھی۔ میں نے وقت سے پہلے دکان بند کی اور گھر کو چل پڑا..... راستے میں ایک جگہ پر میرے قدم رک گئے، میری دائیں آنکھ کی نچلی پلک لرزنے لگی تھی، مغرب میں ڈوبتے سورج کو دیکھ کر بڑبڑایا، یہ آج آنکھ کی نچلی پلک میں لرزش کیسے آگئی؟ پہلے تو اس طرح کبھی نہ لرزی۔ جس وقت دائیں آنکھ کی نچلی پلک لرزی اس وقت سانسوں اور دھڑکنوں میں بے قراری بھی بڑھ گئی، میں رکنے کے بعد چلنے لگا۔ سردی انتہا کی تھی..... شام کے بعد رات آگئی..... ماں اب میرے کمرے میں سونے لگی تھی..... میں اپنی چارپائی پر بچھے بستر پر بیٹھا قلم ہاتھ میں پکڑے سوچے جا رہا تھا، مجھ سے کچھ بھی نہ لکھا جا رہا تھا، ماں سوچکی تھی۔ میں جاگ رہا تھا، میرے سامنے بستر کے اوپر زمین کی چاروں تصویریں پڑی تھیں، سوچتے ہوئے تصویروں کو دیکھے جا رہا تھا، رات بیتی جا رہی تھی۔ میں نے کمرے کی چھت کی طرف دیکھ کر خدا سے پوچھا، یہ سب کیا ہے؟ یہ کیسی محبت ہے؟ یہ عشق کا کون سا روپ ہے؟ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ ایسا پہلے تو کبھی نہ ہوا، ہر سانس، ہر دھڑکن میں بے قراری کی کیفیت ہے، رات کے تین بجے بڑی مشکل سے نیند آئی۔

آنے والی رات میں میری حالت پہلے سے بھی زیادہ مضطرب تھی، اس رات میری بائیں آنکھ کی نچلی پلک لرزنے لگی تھی۔ رات کے بارہ بجے کے بعد میں بار بار بڑبڑایا۔ خدایا! یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ سانس کی تنگی، دل کی بے تابی سے کہیں میں مر ہی نہ جاؤں؟ خدایا! میں ابھی مرنا نہیں چاہتا، زمین کو دیکھنا، اس سے ملنا چاہتا ہوں، اس کا خط کیوں نہیں آ رہا؟ تین خطوں میں سے کسی ایک کا بھی جواب نہیں آیا..... اسے

میرے خط کیوں نہیں مل رہے؟ اگر مل رہے ہیں تو وہ جواب کیوں نہیں لکھ رہی؟ اگر چند دن اور اس کا خط نہ آیا تو میں مرنے جاؤں گا۔ جس طرح میری حالت ہو چکی ہے مجھے آسانی سے موت آ سکتی ہے پر میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ اس رات مجھے تین بجے کے بعد نیند آئی، تین بجے تک بڑبڑاتا رہا، کبھی لیٹ جاتا، کبھی اٹھ بیٹھتا..... جب سانس میں زیادہ تنگی محسوس ہوتی تو اٹھنا پڑتا، اگلے دن میں بے حد اُداس تھا، دکان پر میرا دل نہ لگ رہا تھا، میں کرسی پر بیٹھا دکان کی چھت کو گھورے جا رہا تھا، اسی اثناء میں ساتھ والی دکان سے ٹین نے مجھے اونچی آواز سے پکارا، سانول! تمہارا فون آیا ہے۔

میں کرسی سے اٹھا، بھاگ کر ٹین کی دکان میں آیا، ریسپور اٹھا کر کان سے لگایا، میں نے ہیلو کہا، جواب ملا ”میں زرین۔“ میری قوتِ گویائی کچھ سیکنڈ کے لیے سلب ہو گئی، زرین دوبارہ بولی ”سانول! میں زرین ہوں، تمہاری روشنی۔“ زرین کی آواز بالکل ثمرین جیسی تھی، تبھی تو چند سیکنڈ کے لیے میری قوتِ گویائی سلب ہوئی، پھر میں بولنے لگا، میں نے خطوں کے متعلق پوچھا، اس نے بتایا مجھے تمہارا پہلا خط آج ملا ہے، خط ملتے ہی تمہیں فون کر رہی ہوں، میں نے کہا مجھے تمہارا ابھی تک ایک خط بھی نہیں ملا، اس نے کہا ”میں نے تمہیں تین خط لکھے ہیں۔“ میں نے جواب میں کہا میں نے بھی تمہیں تین خط لکھے ہیں، دس منٹوں میں ہماری زیادہ خطوں کے متعلق باتیں ہوئیں، جب فون پر رابطہ منقطع ہوا، میں بے حد خوش ہونے کے علاوہ حیران بھی تھا، زرین کی آواز، اس کا لہجہ بالکل ثمرین جیسا تھا، میں ٹین کا شکریہ ادا کر کے اپنی دکان پر آ گیا، فون کے ایک گھنٹے کے بعد مجھے زرین کے تینوں خط مل گئے، ڈاکیے نے خط دے کر مجھے مزید حیران کر دیا تھا، آنے والی رات میں نے تفصیل سے زرین کو خط لکھا..... اپنی مضطرب حالت کا ایک ایک لمحہ لکھا۔ زرین کو ثمرین کے متعلق میں نے تفصیل سے بتایا ہوا تھا کہ وہ میری ماضی کی ناکام محبت ہے، میں نے زرین سے کچھ نہ چھپایا تھا، زرین اعلیٰ سوچ کی

مالک تھی ہر خط میں شمرین کی باتیں کرتی تھی..... میں نے اپنے ماضی کی ناکام محبت کی کہانی شروع سے لے کر آخر تک زرین پر آشکار کر دی تھی۔



زرین ہر خط میں لکھنے لگی کہ آ کر مجھے لے جاؤ..... میں گردش حالات میں الجھا ہوا تھا شب و روز حالات کو اچھا کرنے کی جدوجہد میں مصروف عمل تھا زرین میری اس جدوجہد پر خوش تھی۔ زرین میری شدت سے منتظر تھی اس نے خطوں میں یہاں تک لکھ دیا کہ تمہارا میرا نکاح ہو چکا ہے میں تمہاری منکوحہ ہوں آ کر مجھے لے جاؤ۔ ایک سال اور بیت گیا میری جدوجہد رنگ لانے لگی حالات پہلے سے اچھے ہونے لگے میں زرین کے گھر جانے کا سوچنے لگا۔ فون پر جب ہماری بات ہوتی میں زرین سے یہ ضرور پوچھتا کیا تمہارے گھر والے مجھے قبول کر لیں گے؟ میں ادیبانہ ذہن کا مالک ہوں کیا تمہارے گھر والوں کو میری سمجھ آ جائے گی؟ جواب میں زرین پیار سے کہتی تم آؤ تو سہی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ گھر والے میری پسند کو ریجیکٹ کر دیں؟ اس نے اپنی ماں بڑے بھائی اور بڑی بہن کو بھی بتا دیا اب اسے میرا انتظار تھا میں ان کے گھر کچھ نہ کچھ کر کے جانا چاہتا تھا میں ڈرتا اس لیے تھا زرین کی تمام عادات شمرین جیسی تھیں..... کہیں زرین کے گھر والے شمرین کے گھر والوں کی طرح رشتہ دینے سے انکار نہ کر دیں؟ میں ہر رات سوچتا اگر زرین کے گھر والوں نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا تو میرا کیا بنے گا؟ اب میری خود کلامیوں میں ایسے سوال جواب ہونے لگے تھے حالات کو مستحکم کرنے میں تیسرا سال بھی گزر گیا..... ان دنوں مجھے زرین کا ایک خط موصول ہوا جس نے مجھے مزید حیران کر دیا..... خط میں لکھا تھا:

میرے دیریتا!

کئی کہانیوں ناولوں میں پڑھا کہ دیوتا پتھر کے ہوتے ہیں..... تم سے

پہلے میں ان کو پتھر کا ہی سمجھتی تھی..... تم سے محبت کر کے یقین آیا ہے کہ کچھ انسان بھی دیوتا ہوتے ہیں..... وجود رکھتے ہیں، دوسرے انسانوں کی طرح سانس لیتے ہیں، سر سے پاؤں تک انسان کی صورت ہوتے ہیں جیسے کہ تم ہو۔ میں شروع سے محبت کے جذبات کی منکر رہی ہوں، کبھی کسی پر اعتبار نہ کیا، تم سے محبت ہوئی تو اعتبار آیا کہ محبت کے سچے جذبات میں ایک الہامی طاقت ہوتی ہے..... محبت کی سچائی کے سامنے تمام خونی رشتے ٹانوی لگنے لگتے ہیں..... تم نے مجھے ہر خط میں اپنی بے قرار حالت کا لکھا..... میں نے خود سے کہا ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم نے خطوں میں ایسی باتیں کیں کہ مجھے الجواب ہونا پڑا، تم نے مجھے میرے ایک ایک لمحے کی بے قراری کا بتایا..... میں جب جب اُداس ہوئی، تم نے خطوں میں لکھا کہ تم اس وقت اُداس ہو..... اس وقت تمہاری حالت ایسی ہے..... تم اپنی بے چین حالت کا احوال لکھتے رہے۔ میں تمہارے خط پڑھ کر تحریر میں مبتلا ہوتی رہی، خدا کی کائنات میں اتنے اسرار و رموز ہوں گے، میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا.....

تمام گھر والے مجھے سمجھانے لگے تھے ان کی زبانی زمانے کی اونچ نیچ کے لیکچر سن کر میں تنگ آ چکی تھی..... پر مجھے تم سے زیادہ کوئی عزیز نہ تھا، میں نے تمام رشتوں سے تم کو برتر سمجھا..... حالانکہ میری تم سے ابھی ایک ملاقات بھی نہ ہوئی تھی..... پھر جب میں اپنی بڑی باجی نورین کے پاس اس کے گاؤں گئی تو باجی نورین نے مجھے سب سے زیادہ سمجھایا، جب میں اس کے پاس سے واپس آئی تو میں کافی اُداس تھی..... میرے گھر والوں کو میری سمجھ نہ آرہی تھی۔ مجھے تمہاری سچائی کی خود سمجھ نہ آرہی تھی، گھر والوں کو کیسے سمجھاتی.....؟ میں جو تمہیں خط لکھتی کسی میں اپنی اُداس حالت کا نہ لکھتی،

حقیقت یہ تھی کہ میں بے حد اُداس رہنے لگی تھی، میں رات کے وقت خدا سے بہت باتیں کرتی..... رات کے وقت اس سے ہر قسم کی باتیں کرنا میرا معمول بن چکا تھا..... تمہارے خطوں نے مجھے کافی الجھا دیا تھا، سوچ سوچ کر میری آنکھوں کے نیچے سیاہیاں ظاہر ہو گئیں..... کل تمہارا جو خط ملا اسے پڑھ کر میری حالت پہلے سے بھی اُداس ہو گئی..... اس خط کے شروع میں ہی تم نے لکھا کہ تمہاری لکھائی تو لکھائی تمہاری آواز بھی بالکل شمرین جیسی ہے..... باتیں کرنے کا انداز بھی شمرین جیسا ہے..... تمہاری تمام عادات شمرین سے ملتی ہیں.....

جب سے تمہارا خط پڑھا ہے تب سے سوچ رہی ہوں کہ میں ہو بہو شمرین جیسی کیسے ہو سکتی ہوں؟ گزری رات دیر تک یہی سوچتی رہی..... آج کچھ دیر سے اٹھی..... منہ ہاتھ دھو کر واپس کمرے میں آئی تو باجی نورین کو کمرے میں چارپائی پر بیٹھے دیکھا تو خوشی کے ساتھ تھوڑی سی حیران بھی ہوئی کہ باجی گاؤں سے اتنی صبح کیسے آ گئی؟ میں جب اسے ملی تو اس نے مجھے کچھ حیرانگی سے دیکھا..... میں اس کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گئی..... ماں باہر دھوپ میں چارپائی پر سو رہی تھی..... باجی شاید اس لیے کمرے میں آ گئی کہ ماں سوئی ہوئی تھی، اس نے اُسے اٹھانا مناسب نہ سمجھا..... میں نے باجی سے گل آرزو کے بارے میں پوچھا کہ ”وہ کیسی ہے؟“ باجی گل آرزو کے ذکر سے مجھے مزید حیرانگی سے دیکھنے لگی، میں نے پوچھا ”کیا بات ہے؟“ اتنی صبح گاؤں سے اور وہ بھی اکیلی؟ گل آرزو ساتھ کیوں نہیں آئی؟ اور یہ تم مجھے اس طرح سے کیوں دیکھ رہی ہو؟ خیریت تو ہے نا!

”ہاں سب خیریت ہے۔“ باجی آہستہ سے بولی ”زرمین! سانول سچا

اور اچھا انسان ہے۔“ اب میری حیران ہونے کی باری تھی..... باجی نورین مجھے ٹرانس میں لگ رہی تھی..... باجی نے تمہارا ذکر کر کے مجھے سوچوں میں غلط کر دیا..... پھر باجی خود ہی بتانے لگی..... زمین! دس دن پہلے گل آرزو کے خواب میں ایک سفید داڑھی والا بابا آیا..... اس نے گل آرزو کو بتایا کہ تمہاری آنٹی زمین کی شادی بہت دور ہوگی..... آٹھ راتیں وہ سفید داڑھی والا بابا گل آرزو کے خواب میں آ کر یہی کہتا رہا..... گل آرزو مجھے روز صبح اٹھ کر بتاتی..... پہلے تو میں نے یقین نہ کیا..... پھر جب ہر روز صبح گل آرزو بتانے لگی تو میں سوچنے پر مجبور ہو گئی..... گل آرزو اتنی کم سن بھی نہیں..... بارہ تیرہ سال کی ہے، چھٹی جماعت میں ہے.....

پرسوں والی رات وہ سفید داڑھی والا بابا گل آرزو کے خواب میں آیا..... اس رات اس نے یہ بھی بتایا کہ شادی دو سال بعد ہوگی..... کل چھٹی کا دن تھا، گل آرزو گھر میں ہی تھی..... کمرے میں بیٹھ کر اسکول کا کام کر رہی تھی، میں باہر صحن میں جھاڑو دے رہی تھی، جھاڑو دے کر جب میں کمرے میں گئی، گل آرزو کے سامنے کتابیں کاپیاں کھلی پڑی تھیں..... وہ سامنے پڑی خالی کرسی کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہی تھی..... میں نے اسے پکارا..... اس نے میری طرف نہ دیکھا، میں نے اس کے ساتھ چار پائی پر بیٹھ کر اسے جھنجھوڑا..... اس کا چہرہ میرے کندھے سے لگ گیا..... کچھ پوچھنے سے پہلے وہ خود ہی بتانے لگی..... ماما! سامنے کرسی پر وہ سفید داڑھی والا بابا بیٹھا تھا، وہی جو ہر رات میرے خواب میں آتا رہا..... میں کاپی پر لکھ رہی تھی، لکھنے کے دوران میری نظر سامنے پڑی تو وہ کرسی پر بیٹھا مجھے دیکھ رہا تھا..... جب میں نے اسے کرسی پر دیکھا تو اس کو دیکھتی ہی رہ گئی..... اس

نے مجھے بتایا، تمہاری آنٹی زرین کی شادی سانول سے ہوگی..... سانول اچھا انسان ہے، وہ اسے ہمیشہ خوش رکھے گا، تم اپنی ماما سے کہہ دینا کہ وہ اپنی ماں اور بھائی کو سمجھا دے، جب سانول زرین کا رشتہ مانگنے آئے تو انکار نہ ہو..... اتنا کہہ کر وہ کرسی سے غائب ہو گیا..... میں نے گل آرزو کے چہرے کو اپنے کندھے سے ہٹا کر غور سے دیکھا..... گل آرزو اب نارمل حالت میں تھی..... وہ کاپیوں، کتابوں کی طرف متوجہ ہو گئی، میں اٹھ کر باہر صحن میں پڑی چارپائی پر بیٹھ کر سوچنے لگی کہ یہ سب کیا ہے؟ گل آرزو کے خواب میں جو سفید داڑھی والا بابا آتا رہا ہے، وہ کون ہے؟ آج وہ حقیقت میں گل آرزو کے سامنے کرسی پر بیٹھا رہا..... اس نے گل آرزو کو سانول کا نام بتایا..... گل آرزو کے سامنے میں نے آج تک سانول کا ذکر نہیں کیا، وہ سانول کی ذات سے لاعلم رہی..... یہ کیسا خدائی اسرار ہے؟

آنے والی رات مجھے بہت دیر سے نیند آئی..... گل آرزو میرے ساتھ والی چارپائی پر سوئی ہوئی تھی..... میں بار بار اسے دیکھ رہی تھی..... آج صبح میں گل آرزو کو اسکول بھیجنے کے بعد سیدھی ادھر آئی ہوں، صبح میں نے گل آرزو سے پوچھا، رات سفید داڑھی والا بابا خواب میں آیا؟ گل آرزو نے نفی میں سر ہلایا..... زرین! مجھے کل سے ایک پل چین نہیں..... سوچ سوچ کر تھک چکی ہوں..... مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی کہ یہ سب کیا ہے؟“، باجی نورین اتنا کہہ کر چپ ہو گئی.....

میں تو پہلے ہی چپ تھی، باجی کچھ دیر مجھ سے باتیں کرنے کے بعد اٹھ کر چلی گئی، میں چارپائی پر لیٹ گئی، تم کو سوچتے سوچتے مجھے نیند آ گئی، ابھی کچھ دیر پہلے اٹھی ہوں اور اب تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔ سانول! میں محبت کی

سچائی کو مان چکی ہوں کہ اس میں بہت طاقت ہوتی ہے، یہ اپنا آپ منوالیتی ہے..... اب مجھے یقین آچکا ہے کہ تم جو خطوں میں لکھتے رہے، وہ سچ تھا، تم انسان کی صورت دیوتا کا روپ ہو، میں تمہاری ہمیشہ پوجا کروں گی، تمہاری باندی بن کر رہوں گی، تمہیں ہمیشہ خوش رکھوں گی کہ تم میرے دیوتا ہو۔

تمہاری داسی

زرین

زرین کا خط پڑھنے کے بعد میں دیر تک سوچوں میں غلطاں رہا، خط جیب میں ڈالا، کرسی سے اٹھا، دن کے تین بجے دکان بند کی اور گھر آ گیا.....

○.....○.....○

زرین نے انتظار کا دیا نہ سمجھنے دیا۔ اس کی آنکھوں میں میرے آنے کی اُمید تھی، اسے یقین تھا کہ میں آؤں گا، ایک سال اور بیت گیا، میرے حالات پہلے سے کافی مستحکم ہو گئے، میں زرین کے گھر جانے کے متعلق سوچنے لگا تھا، پھر میں نے اسے خط میں لکھ دیا کہ میں ماں کو لے کر تمہارے رشتے کے لیے آ رہا ہوں۔ میں نے خط میں آنے کی تاریخ لکھ دی۔ زرین کو جب میرا یہ خط ملا، اس نے خط پڑھتے ہی مجھے فون کیا۔ وہ بے حد خوش تھی، مجھ سے بار بار پوچھ رہی تھی ”سانول! تم ہمارے گھر آ رہے ہو، میرا رشتہ مانگنے کے لیے، میں اتنی بڑی خوشی کو کس سے شیئر کروں؟“ اس دن فون پر زرین نے خوشی کی حالت میں ایسی باتیں کیں جو پہلے کبھی نہ کیں، اس کی باتوں نے مجھ میں مزید حوصلہ پیدا کر دیا۔ زرین کے فون کے بعد بے قراری نے میری روح میں مزید ہلچل مچا دی..... میری آنکھوں کی دونوں پلکیں بار بار لرزنے لگیں..... سانسوں اور دھڑکنوں میں بے چینی بڑھ گئی، جس دن کا میں نے خط میں لکھا تھا، وہ دن بھی آ گیا۔ ماہِ رمضان کا مہینہ تھا، سحری کے وقت ماں نے مجھے اٹھایا..... روزہ رکھنے کے بعد

جب فجر کی اذان ہوئی، میں فجر کی نماز پڑھنے مسجد میں آ گیا، نماز پڑھنے کے بعد تیز قدموں کے ساتھ واپس گھر آیا، ماں فجر کی نماز پڑھ چکی تھی..... وہ بیگ میں وہ سامان رکھ رہی تھی جو ہمیں ساتھ لے جانا تھا..... زرین کے لیے کچھ جوڑے اور ایک سونے کی انگوٹھی تھی..... اس کے علاوہ ہمارا کچھ اپنا سامان تھا..... دن کے دس بجے جانے والی بس میں ہمیں سوار ہونا تھا، ابھی کافی وقت پڑا تھا..... تیاری کرنے کے بعد ہم اپنی اپنی چارپائی پر آ گئے..... میں اپنی چارپائی پر بیٹھ کر زرین کو خط لکھنے لگا..... یہ خط میں زرین کو اس کے گھر میں جا کر دینا چاہتا تھا..... آٹھ بجے تک میں نے اسے خط لکھا، جب خط مکمل ہو گیا، میں نے اسے تہہ کر کے جیب میں ڈال لیا، زرین نے فون پر بتایا تھا کہ کافی لمبا سفر ہے، صبح چلو تو رات کے وقت ہمارے گھر پہنچو گے..... اس نے خط کے علاوہ فون پر مجھے اپنے گھر کا ایڈریس تفصیل سے سمجھا دیا تھا..... اس کا سمجھایا ہوا ایڈریس ذہن نشین ہو چکا تھا..... خط لکھتے وقت میری حالت کافی مضطرب تھی..... اپنی مضطرب حالت سے توجہ ہٹانے کے لیے میں نے ٹیلی ویژن چلا دیا..... ٹیلی ویژن سے مجھے خاص رغبت نہ تھی..... میرا مرحوم سوتیلا باپ قدیر شوق سے ٹیلی ویژن دیکھتا تھا..... نو، سوا نو بجے تک میں ٹیلی ویژن سے دل بہلانا چاہتا تھا، وقت گزرتا رہا..... میں چارپائی پر لیٹ گیا..... میرا چہرہ رضائی سے باہر تھا..... کافی سردی تھی..... میری آنکھیں ٹیلی ویژن سے ہٹ کر چھت کو دیکھنے لگیں..... مجھے زرین شدت سے یاد آنے لگی..... میں اس کے متعلق سوچنے لگا..... اسی وقت مجھے جھٹکا محسوس ہوا، چھت سے لگا پٹکھا ہلنے لگا، میں جلدی سے چارپائی سے اٹھا، میں نے ماں کو آواز دے کر اٹھایا۔

”ماں! اٹھو زلزلہ آ گیا ہے۔“ ماں کو ہاتھ سے پکڑ کر کمرے سے باہر لایا.....

کمرے کے اندر ٹیلی ویژن چل رہا تھا..... میں کمرے کے باہر کھڑا ہو کر دروازے سے چھت سے لگے نچکے کو دیکھ رہا تھا۔ جو ہلنا بند ہو چکا تھا..... زلزلہ ختم ہو چکا تھا..... اس

کے باوجود ہمارا کمرے کے اندر جانے کو دل نہیں کر رہا تھا..... کافی دیر ہم کمرے سے باہر کھڑے رہے، جب ہمیں یقین ہو گیا کہ زلزلہ ختم ہو چکا ہے، ہم کمرے کے اندر آ گئے، چارپائی پر بیٹھ کر ٹیلی ویژن دیکھنے لگے..... ٹیلی ویژن پر زلزلے کے متعلق بتایا جا رہا تھا..... جتنی ان کے پاس معلومات تھیں، وہ بتائے جا رہے تھے، ملک کے شمالی علاقہ جات میں شدت کا زلزلہ آیا تھا، میں ماں کی طرف ماں میری طرف دیکھ رہی تھی..... مجھ پر شک کی کیفیت تھی، میں نے ماں سے کہا ماں! میں فون کر کے زمین کے گھر والوں کی خیریت کا پتہ کرنے شہر جا رہا ہوں..... ماں جواب میں خاموش رہی..... میں گاؤں سے شہر آیا، شہر کی ہر دکان پر زلزلے کی باتیں ہو رہی تھیں..... میں ایک P.C.O میں داخل ہوا۔ اندر بیٹھا نو جوان مجھے کافی خوش اخلاقی سے ملا..... اس نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا کہا..... میں نے کھڑے کھڑے ہی اسے فون ملانے کا کہا..... اس نے بار بار فون ملایا..... اس نے کہا جس شہر کا یہ نمبر ہے وہاں شدید زلزلہ آیا ہے، وہاں کے تمام فون ڈیڈ ہو چکے ہیں..... میری آنکھیں بھیگ گئیں..... میں سر جھکائے P.C.O سے باہر آ گیا۔

واپس گھر آتے وقت تمام راستے بڑبڑاتا آیا کہ ایسا نہیں ہو سکتا..... زمین کا گھر محفوظ رہا ہوگا..... اُسے کچھ نہیں ہو سکتا..... واپس گھر آیا، ماں کمرے میں چارپائی پر بیٹھی ٹیلی ویژن دیکھ رہی تھی، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، اس نے مجھے دیکھا، جلدی سے آنکھوں کے آنسو پونچھے، مجھ سے پوچھا۔ فون کر لیا؟ میں سر جھکائے ماں کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گیا..... میں نے نفی میں سر ہلایا..... بھیگی آنکھوں سے ٹیلی ویژن دیکھنے لگا..... مجھ سے زیادہ دیر ٹیلی ویژن نہ دیکھا گیا..... میں اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا..... ٹیلی ویژن پر بار بار بالاکوٹ کا بتایا جا رہا تھا کہ وہاں شدید زلزلہ آیا ہے..... بالاکوٹ میں زمین کا گھر تھا..... بالاکوٹ میں ہمیں پہنچنا تھا..... گھر سے باہر آ کر میں نے

آسمان کی طرف دیکھا..... آسمان پر سورج چمک رہا تھا..... میری آنکھیں زیادہ دیر آسمان کو نہ دیکھ سکیں..... نیچے جھٹک گئیں..... میں آنکھیں جھکائے چلتا ہوا قبرستان میں آگیا..... وان کے پیڑ کے نیچے آکر بیٹھ گیا..... میرے چاروں طرف قبریں تھیں..... ان قبروں کو دیکھتے ہوئے میری آنکھیں بھیگنے لگیں..... آٹھ بج کر باون منٹ سے پہلے میری سانسوں اور دھڑکنوں میں شدت کی بے قراری تھی..... آٹھ بج کر باون منٹ کے بعد تمام بے قراری ختم ہوگئی..... کئی بستیاں، شہر لرز گئے تھے، سامنے قبروں کو دیکھتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے.....



زمین مر نہیں سکتی، وہ میرے نصیب میں لکھی جا چکی ہے، خدا اسے کیسے مار سکتا ہے؟.....

میں چارپائی پر لیٹا بڑبڑا رہا تھا۔ میرا چہرہ رضائی سے باہر تھا۔ ماں کافی دیر تک جاگتی رہی۔ میری دل جوئی کرتی رہی۔ ہم ماں بیٹا کو زلزلہ نے کافی اداس کر دیا تھا۔ میں تمام دن قبرستان میں وان کے نیچے اداس بیٹھا رہا۔ آسمان کی طرف دیکھ کر بڑبڑاتا رہا کہ زر میں نہیں مر سکتی۔ شام کے وقت بوجھل قدموں کے ساتھ گھر آیا گھر آتے ہی چارپائی پر لیٹ گیا۔ ماں دوسری چارپائی پر لیٹی مجھ سے زلزلے کے موضوع پر باتیں کرتی رہی۔ ماں مجھ سے باتیں کرتی کرتی سو گئی۔ میری بڑبڑاہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ بڑے عرصے کے بعد میں خدا سے اس طرح باتیں کر رہا تھا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں نے گھڑی پر وقت دیکھا رات کا پچھلا پہر شروع ہو چکا تھا۔ رات کے تین بجے کے قریب مجھے سانسوں میں بے قراری محسوس ہوئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ صبح آٹھ بج کر باون منٹ کے بعد اب رات کے تین بجے سانسوں میں اضطرابی کیفیت محسوس ہوئی میری دائیں آنکھ کی نچلی پلک معمولی سی لرزی۔ میرے سوچ و بچار میں

اضافہ ہو گیا۔ میں نے خود سے کہا میرا دل کہتا ہے، زرین زندہ ہے! کہیں ایسا تو نہیں
 ثمرین نے مجھے شدت سے یاد کیا۔ اس کی یاد کے عمل سے میری سانسوں
 ، دھڑکنوں میں بے قراری پیدا ہوئی؟ نہیں۔ زرین کی محبت نے عبادت کا روپ
 دھارا..... اس لیے میری آنکھوں کی پلکیں زرتی رہیں۔ سانسوں اور دھڑکنوں میں بے
 قراری آتی رہی۔ اب جو میری سانسوں میں بے قراری کی لہر آئی ہے۔ آنکھ کی پلک
 لرزی ہے۔ یہ باور کرا رہی ہے کہ زرین زندہ ہے..... وہ نہیں مر سکتی۔ اس نے میری
 دلہن بنا ہے۔ سحری کے وقت تک مجھے نیند نہ آئی۔ سحری کے وقت اٹھ کر ماں کے ساتھ
 سحری کی۔ فجر کی اذان سن کر اٹھا۔ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر صحن میں آ گیا۔ آسمان کی
 طرف دیکھا آسمان پر طلوع سحر کے ستارے چمک رہے تھے۔ میں چلتا ہوا گھر سے باہر
 آ گیا مسجد کی طرف چل پڑا مسجد میں فجر کی نماز کے بعد میں نے خدا سے زرین کی
 سلامتی کی گڑ گڑا کر دعا مانگی..... میری آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ جب میرے دل کا
 بوجھ ہلکا ہوا..... میں مسجد سے اٹھ کر گھر آ گیا۔ کمرے میں آ کر چارپائی پر اوپر رضائی کر
 کے لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی۔

صبح کے وقت سونے کے بعد میں کچھ دیر بعد اٹھا۔ ماں باہر صحن میں تھی مجھے
 سانسوں اور دھڑکنوں میں بے قراری محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے رات کے وقت بالا
 کوٹ جانے کا سوچ لیا تھا..... اب اٹھتے ہی بیگ میں مئیں نے کپڑے اور کمبل
 ڈالے..... تمام جمع پونجی جیب میں ڈالی اپنے اوپر چادر کی اور کمرے سے باہر آ گیا۔
 ماں باہر صحن میں چارپائی پر بیٹھی تھی۔ میں اس کے قریب گیا اس نے میرے کندھے پر
 بیگ دیکھا تو سمجھ گئی کہ میں کہاں جا رہا ہوں میں ماں کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ
 گیا۔ ماں نے مجھے دعائیں دیں، میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ جب میں اس
 کے پاس سے اٹھنے لگا اس نے پیار سے میری پیشانی چوم لی، مجھے دعاؤں کے ساتھ

رخصت کیا میں اپنے گھر کا بیرونی دروازہ کھول کر سڑک پر آگیا۔ اس سڑک پر چلتا ہوا شہر آیا۔ اڈے پر کھڑی بس پر بیٹھ کر لاہور آگیا۔ لاہور سے راولپنڈی اور راولپنڈی سے بالا کوٹ۔

زلزلہ سے اسلام آباد، راولپنڈی میں بھی نقصانات ہوئے تھے، امدادی کارروائیاں جاری تھیں میں ایک امدادی ٹیم کے ساتھ شامل ہو کر بالا کوٹ آیا۔ رات کے پچھلے پہر ہماری ٹیم بالا کوٹ پہنچی۔ ہم نے ویگن سے تمام سامان اتارا۔ ویگن ہمیں بالا کوٹ چھوڑ کر واپس چلی گئی۔ ہماری ٹیم دوسری امدادی ٹیموں کے ساتھ مل گئی۔ بالا کوٹ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ شدید سردی تھی ہم بلے کے نیچے دبے انسانوں کو باہر نکالنے کی کوشش میں لگ گئے۔ زلزلے نے بالا کوٹ کو کھنڈرات میں تبدیل کر دیا تھا۔ انسانوں کے گھر بلے کے ڈھیر بن چکے تھے۔ ہر طرف آہ و بکا تھی زندہ بچ جانے والے بلے کے نیچے دبے اپنے عزیزوں کے لیے رو رہے تھے۔ زخموں کو طبی امدادی جارہی تھی جو زیادہ زخمی تھے انہیں راولپنڈی کے ہسپتالوں میں پہنچایا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے زخموں کو بلے کے نیچے سے نکالا کئی لاشیں اپنے ہاتھوں سے سپرد خاک کیں۔ سرد ہواؤں کے تھپڑوں کے باوجود ہمارے حوصلوں میں کمی نہ آئی، ہم بلے کے نیچے سے زخموں کو نکالتے رہے اور انہیں طبی کیمپوں تک پہنچاتے رہے۔

دو تین دن کے بعد باہر کے ملکوں سے امدادی ٹیمیں آنا شروع ہو گئیں۔ میں نے بلے کے نیچے سے زمین کو بہت تلاش کیا۔ زمین کا کوئی پتہ نہ چلا میری سانسوں اور دھڑکنوں میں بے قراری بڑھ گئی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ زمین زندہ۔ میری پلکیں زیادہ لرزنے لگی تھیں۔ پلکوں کی لرزش نے مجھے یقین دلایا کہ زمین زندہ ہے۔ بلے کے ڈھیروں کو دیکھ کر میں آسمان کی طرف بھگی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ بلے میں تبدیل ہوئے بالا کوٹ کو دیکھ کر میری سوچ بچار میں اضافہ ہوا۔ رات کے وقت امدادی ٹیمیں

کیمپوں میں آجائیں۔ مجھے دیر تک نیند نہ آتی..... میں زرین کے متعلق سوچتا رہتا، دن کے وقت بلے کے ڈھیروں کو دیکھ کر میری آنکھوں میں یاسیت بڑھ جاتی۔ جن بلے کے ڈھیروں کے نیچے سے بچوں کی لاشیں نکلتیں۔ ان بلے کے ڈھیروں پر بیٹھ کر میں دیر تک آسمان کی طرف دیکھتا رہتا۔ ایسے ہی ایک گھر کے بلے پر بیٹھ کر میں نے المیہ نظم ”سوگوار“ لکھی۔

الاکھوں میرے اپنے

مجھ سے ملے بغیر ہی

وداع ہو گئے

ان کے غم میں

میری آنکھیں افسردہ

روح میری

اجتماعی قبروں سے

ٹیک لگائے

زندگی کی بے ثباتی پر

ہے خاموش ماتم کناں

سوچ، خیال کے

بال بکھرے ہیں

مل رہی خیال کی کنگاہی

نہ آئینہ آگہی

دل میں ہے درد اتنا

کہ ہر سانس میں ہے محشر برپا

نہ آگن رہے

نہ گھر

نہ بچے

نہ لوری دینے والی مائیں

نہ ڈانٹنے والے باپ

بچی ہیں سو گوار ہوا میں

ان میں خوشی کے گیت نہیں

ہیں دکھ کے نوحے

ہیں گردن میں انگی آہیں

یہ کیسی قیامت ہے خدا یا!

کہ

میری آنکھیں

شب و روز تقدیر سے

نوحہ کناں ہیں

☆☆☆

بالاکوٹ میں جہاں جہاں کیمپ لگے ہوئے تھے، میں وہاں وہاں گیا۔ مجھے زمین نہ ملی۔ بالاکوٹ کے زندہ بچ جانے والے لوگوں کو زمین کی تصویر دکھائی، لیکن کسی سے معلوم نہ ہو سکا۔ اس سانحہ نے بچ جانے والوں کے ذہن ماؤف کر دیے تھے۔ کئی سکتہ کی حالت میں تھے۔ دس دن بالاکوٹ میں امدادی ٹیموں کے ساتھ کام کیا، باوجود تلاش کے مجھے زمین کا سراغ نہ ملا۔ جس امدادی ٹیم کے ساتھ میں کام کر رہا تھا انہوں نے مجھے کچھ زخمیوں کے ہمراہ ایسبولینس میں راولپنڈی بھیجا۔ راولپنڈی کے جس ہسپتال میں

زمین.....زمین..... میری پکار پر زمین کی آنکھیں کھلتی چلی گئیں۔ اس کی آنکھیں میرے چہرے پر ٹھہر گئیں۔ نورین نے مجھے پہچان لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، میں نے گل آرزو کے سر پر ہاتھ پھیرا، بیڈ پر زمین کے پاس بیٹھ گیا۔ نورین حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے بیچ پر بیٹھ گئی۔ زمین رونے لگی، زمین کی ہچکیوں نے میری آنکھیں بھگو دیں۔ اس کے آنسو پونچھتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو بہہ

نکلے.....

میں نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھے باوجود چپ کرانے کے زمین کی ہچکیاں بند نہ ہو رہی تھیں۔ نورین اور گل آرزو کے آنسو بھی نہ رک رہے تھے، تمام بڑے صدمے کے زیر اثر لگ رہے تھے۔ نورین بتانے لگی، ۸، اکتوبر کی صبح کو میں گل آرزو کو سکول چھوڑنے جا رہی تھی، سکول سے کچھ دور، سڑک پر تھے کہ زلزلے کا پہلا جھٹکا لگا، میں گل آرزو کو خود میں چھپا کر نیچے بیٹھ گئی، زمین پنڈولم کی طرح ہلنے لگی، گاؤں کے گھر گرنے لگے، لوگ ملبے کے نیچے دبے گئے، جب زلزلہ بند ہوا گاؤں کے زیادہ گھر ملبے میں تبدیل ہو چکے تھے۔ میں گل آرزو کو لے کر اپنے گھر کی طرف آئی، ہمارا گھر مکمل طور پر گر چکا تھا۔ گل آرزو بلند آواز سے رونے لگی، میں اسے چپ کراتے ہوئے رو رہی تھی، کئی گھنٹے ہم اپنے گھر کے سامنے بیٹھے رہے، پھر امدادی ٹیمیں پہنچیں، مجھے ماں بھائی اور زمین کی فکر دامن گیر ہوئی، ۸، اکتوبر کی شام کو امدادی ٹیموں کی ویگن میں بیٹھ کر میں اور گل آرزو بالا کوٹ آئیں..... بالا کوٹ کا شہر تباہ ہو چکا تھا۔ ہر طرف آہ و بکا کی آوازیں تھیں۔ زندہ بچ جانے والے ملبے کے نیچے دبے اپنے عزیزوں کے لیے ماتم و گریہ زاری کر رہے تھے۔ امدادی ٹیمیں ملبے کے نیچے سے انسانوں کو نکالنے کی کوشش میں لگے ہوئی تھیں۔ بالا کوٹ میں جہاں ہمارا گھر تھا اب وہاں ملبہ ہی ملبہ تھا۔ اس ملبہ سے امدادی ٹیموں نے زمین کو نکالا۔ زمین بے ہوش تھی، نزدیکی میڈیکل کیمپ سے اسے طبی امداد دی گئی۔ میں اور گل آرزو روتی ہوئی ساتھ تھیں۔ زمین کی حالت بہت سیریس تھی اس کی دونوں ٹانگیں کچلی گئی تھیں۔ سیریس حالت کو دیکھتے ہوئے اسے فوراً ایمبولینس میں ڈالا گیا۔ میں اور گل آرزو ایمبولینس میں اس کے ساتھ آئیں۔ یہاں راولپنڈی میں اس کی دونوں ٹانگوں کا آپریشن ہوا۔ اس کی دونوں ٹانگیں کاٹ دی گئیں۔ نورین اتنا بتا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ گل آرزو کی آنکھیں رو رو کر سوچ چکی

تھیں۔ زرمین کی ہچکیاں میرے دل میں پیوست ہو رہی تھیں میں خاموش تھا۔
 نورین آنسو پونچھتے ہوئے بولی، ماں اور بھائی دونوں زلزلے کی نذر ہو گئے
 میں نے دکھ سے وارڈ کی چھت کی طرف دیکھا..... وارڈ کی چھت آنسوؤں میں دھندلا
 گئی۔ ہم سب کے بیچ کافی دیر تک خاموشی رہی۔ میں نورین کی جانب دیکھتے ہوئے
 بولا۔ ”زلزلے کے دوسرے دن میں بالا کوٹ آگیا تھا۔ بالا کوٹ میں زرمین کو بہت
 تلاش کیا۔ مجھے زرمین نہ ملی۔ میرا دل گواہی دیتا تھا کہ زرمین زندہ ہے۔ دس دن میں
 امدادی ٹیموں کے ساتھ کام کرتے ہوئے اسے تلاش کرتا رہا۔ اسے تلاش کرتے کرتے
 یہاں تک آیا۔ اب زرمین کو اپنے سامنے دیکھ کر یقین آیا ہے کہ میرا دل صحیح گواہی دیتا
 تھا۔ زرمین کو اپنی ٹانگوں کی محرومی پر اتنا نہیں رونا چاہئے۔ جب میں آچکا ہوں..... اب
 انتظار کی نوبت نہیں آئے گی۔ یہیں سے اسے دلہن بنا کر اپنے گھر لے جاؤں گا۔ اتنا
 کہنے کے بعد میں چپ ہو گیا۔ میرا چہرہ نیچے جھکا۔ میں نے بڑے پیار اور عقیدت سے
 زرمین کی پیشانی پر ہونٹ رکھ دیئے۔

☆=====ختم شد=====☆